نور کے پھول

حکیم محمد سعید

مکتبہ پیامِ تعلیم۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

نور کے پھول

حکیم محمد سعید

مکتبہ پیامِ تعلیم، جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

تقسیم کار

صدر دفتر:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی 110025

شاخیں:

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی 110006

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنس بلڈنگ۔ بمبئی 400003

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ یونی ورسٹی مارکیٹ۔ علی گڑھ 202001

پہلی بار مارچ ۱۹۸۹ء۔ تعداد 1000 قیمت: =/9

لبرٹی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس دریا گنج نئی دہلی ۲ میں طبع ہوئی۔

پیش لفظ

جس طرح ساری دُنیا کا اندھیرا بھی ایک چھوٹے سے چراغ کی روشنی کو مٹا نہیں سکتا اِسی طرح ایک اچھی کتاب کے سامنے جہالت کے اندھیرے نہیں ٹھیر سکتے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کتاب اور علم کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ علم آدمی کو انسان بناتا ہے۔ اشرف بناتا ہے، بُرے اور بھلے کی تمیز سکھاتا ہے اور کتاب ذہن کو جلا بخشتی ہے، کتاب ذہن کو روشن کرتی ہے!

کتاب ایک اچھی ساتھی ہے، کتاب ایک سچا دوست ہے۔ اچھا دوست وہی ہوتا ہے جو دوست کا بھلا چاہتا ہے۔ دوست یہ چاہتا ہے کہ ہم صاحبِ کردار ہوں، ہم میں امانت ہو، دیانت ہو، صداقت ہو۔ ہمارے اخلاق ایسے اچھے ہوں کہ سب ہمیں پسند کریں۔ ہماری ذات سے کسی کو دُکھ نہ پہنچے۔ اچھی کتاب ہمیں ایسا ہی اچھا انسان بنا سکھاتی ہے۔

جس طرح دُنیا میں اچھے اور بُرے لوگ ہیں، اسی طرح کتابیں بھی اچھی اور بُری ہوتی ہیں۔ اچھوں کی صحبت اچھا بناتی ہے اور بُروں کے پاس بیٹھ کر تو آدمی بُری باتیں ہی سیکھتا ہے۔ تمھیں ہمیشہ اچھی کتابیں تلاش کر کے پڑھنی چاہییں تا کہ تم اچھے بنو۔

بچّے مجھے عزیز ہیں۔ وہ سب میرے ہیں۔ میری خواہش ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ میرے کشورِ حسین کے نونہال نیک ہوں، اچھے ہوں، سچے ہوں، بہادر ہوں اور ہمیشہ علم کی جستجو میں رہیں۔ اسی لیے ہمدرد نے "نونہال ادب" کا یہ سلسلہ شروع کیا ہے۔ اس منصوبے کے تحت تفریحی، معلوماتی سائنسی، دینی، اخلاقی، تاریخی اور ہر قسم کی مفید، معیاری اور خوش نما کتابیں آسان زبان میں شائع کی جا رہی ہیں کہ جن کے مطالعے سے ہمارے نونہال تفریح کے ساتھ ساتھ اپنے ذہن کو روشن اور اپنے اخلاق کو سنوار سکیں۔

یہ کتاب نونہال ادب کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

(حکیم محمد سعید)

"تم میں سے کچھ لوگ تو ایسے
ضرور رہنے چاہییں جو نیکی
کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم
دیں اور برائیوں سے روکتے
رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں
گے وہی فلاح پائیں گے۔"

سورۃ آل عمران : ۱۰۴

فہرست

دُنیا میں زندگی گزارنے کا طریقہ	۷
اسلام مسلمانوں سے کیا چاہتا ہے؟	۱۱
رسول اللہؐ کی اطاعت	۱۵
رسول اللہؐ حاکم کی حیثیت	۱۸
اللہ کا ڈر	۲۲
اللہ کا شکر	۲۶
اللہ کی راہ میں خرچ کرنا	۲۹
اطمینانِ قلب	۳۳
عِلم	۳۷
عمل کی اہمیت	۴۰
خدمتِ خلق	۴۳
بندوں کے حقوق	۴۶
اچھے اخلاق	۴۹
سچائی	۵۳
حسد	۵۶
بدگمانی	۵۹
نفاق	۶۱
لالچ	۶۴
غیبت	۶۷
نرمی اور برداشت	۷۰
شرم و حیا	۷۳
حلال روزی	۷۶
کام چوری	۸۰
صفائی اور پاکیزگی	۸۳
صحت	۸۶
مجلس کے آداب	۹۰
قومی کردار	۹۳

"مالک! ہم نے ایک پکارنے
والے کو سُنا جو ایمان کی طرف
بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے
رب کو مانو۔ ہم نے اس کی
دعوت قبول کرلی۔ پس اے
ہمارے آقا! جو قصور ہم سے
ہوئے ہیں اُن سے درگزر فرما،
جو برائیاں ہم میں ہیں اُن کو دُور
کردے اور ہمارا خاتمہ نیک
لوگوں کے ساتھ کر۔"

سورۃ آل عمران ۱۹۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

"شروع کرتا ہوں میں اللہ کے نام سے جو رحمٰن اور رحیم ہے۔

دنیا میں زندگی گزارنے کا طریقہ

دنیا میں زندگی بسر کرنے کے بہت سے طریقے ہیں۔ انسان ان میں سے کسی بھی طریقے سے زندگی گزار سکتا ہے۔ وہ جو طریقہ اپناتا ہے اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس چیز کو اچھا سمجھتا ہے اور کس کو بُرا۔ زندگی کا مقصد بھی اسی سے طے ہوتا ہے۔ اسلام بھی زندگی بسر کرنے کا ایک طریقہ بتاتا ہے اور ہمارے لیے اچھے اور بُرے کا معیار مقرر کرتا ہے۔ ہمیں بتاتا ہے کہ دنیا میں کس طرح رہیں، لوگوں کے ساتھ کس طرح برتاؤ کریں اور وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ اللہ کی بندگی کا کیا مطلب ہے۔ اس کی عبادت ہمیں کیسے کرنی چاہیے۔

یہاں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اسلام میں دنیا اور دین الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ اس کے ماننے والے دنیا سے الگ تھلگ زندگی گزاریں۔ وہ یہ نہیں پسند کرتا کہ مسلمان بس تھوڑی سی عبادت کرلیں، نماز پڑھ لیں، روزہ رکھ لیں اور پھر جو چاہیں کرتے پھریں، جس طرح چاہیں سیاست چلائیں، جو چاہیں پڑھیں لکھیں، جیسا چاہیں لوگوں کے ساتھ سلوک کریں، جس طرح چاہیں لین دین کریں۔ وہ مسلمانوں کو اس کی اجازت نہیں دیتا کہ زندگی کے ان معاملات میں وہ اپنی من مانی کریں۔ یہ اللہ کے حکم اور اس کے رسولؐ کی تعلیم کے خلاف ہے۔ قرآن اور سنت کے مطابق ہماری پوری زندگی عبادت ہے۔ قرآنِ پاک میں اللہ نے فرمایا ہے:

"ہم نے جن اور انسان کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ عبادت کریں۔" الذّٰریات: ۵۶

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ اس کی عبادت کرے۔ گویا دنیا میں زندگی بسر کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ قرآن پاک اور اللہ کے رسولؐ کی سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کا ہر کام عبادت ہو سکتا ہے اور اگر ان باتوں کو جو اللہ نے بنائی ہیں ذہن میں رکھا جائے تو اس کا ہر کام عبادت ہو گا۔ دنیا میں زندگی بسر کرنے کے جو طریقے ہیں یہ ان سب سے الگ طریقہ ہے۔ یہ طریقہ ایسا ہے کہ انسان کی سیاست، اس کا ملنا جلنا، اس کا کاروبار، اس کی تعلیم سب عبادت بن جاتے ہیں۔ بس ضروری یہ ہے کہ یہ سب کام ہوں، اس طریقے کے مطابق ہی جو اللہ نے اور اس کے رسولؐ نے بتایا ہے۔

اسلام سے پہلے دوسرے مذہبوں میں عبادت کا مطلب صرف یہ تھا کہ کچھ مقررہ وقتوں میں ایک خاص طریقے سے کوئی رسم ادا کر لی جائے، بس۔ اسلام نے پہلی بار یہ بتایا کہ عبادت مسجد ہی میں نہیں پارلیمنٹ میں بھی ہو سکتی ہے، اسکول اور کالج میں بھی ہو جاتی ہے، دُکان میں بھی ہو جاتی ہے۔ ہاں شرط یہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو بندہ سمجھیں اور ہر وقت اپنے مالک اور آقا کی مرضی اور اس کی خوشی کا خیال رکھیں۔ ہمارے مالک اور آقا نے ہمارے لیے جو حدیں مقرر کر دی ہیں ان کی پابندی کرتے ہوئے ہم جو بھی کام کریں گے وہ عبادت ہو گا، چاہے یہ روزی کمانے کے لیے ہو یا کسی پردیسی کے ساتھ ہمدردی کے لیے۔

اس طرح جو زندگی گزاری جائے گی وہ امن و سکون کی زندگی ہو گی، آرام و چین کی زندگی ہو گی، خوشی کی زندگی ہو گی۔ اس میں کوئی کسی کا حق نہیں مارے گا، کوئی کسی کو ستائے گا نہیں۔

اسلام بتاتا ہے کہ انسان کو اس دنیا میں تھوڑے دن رہنا ہے اور آنے والی زندگی کے لیے تیاری کرنی ہے، جو ہمیشہ رہے گی۔ اس لیے وہ لوگ جو اسلام پر ایمان رکھتے ہیں وہ دنیا میں بے نتھے بیل کی طرح زندگی نہیں گزار سکتے۔ انھیں قرآنِ پاک کا یہ حکم ہمیشہ یاد رہتا ہے:

"اے لوگو، جو کچھ زمین میں حلال اور پاک ہے اس میں سے کھاؤ اور شیطان کے کہے پر نہ چلو کہ وہ تمھارا کھُلا دشمن ہے۔ وہ تو تمھیں بُرائی اور

بے حیائی کا اور اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہنے کا حکم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے۔" (البقرہ: ۱۶۸ - ۱۶۹)

قرآن پاک اس طرح ہمیں بتاتا ہے کہ ہم زمین سے وہ سب کچھ حاصل کریں اور اس سے فائدہ اُٹھائیں جس کی ہمیں اللہ اور اس کے رسولؐ نے اجازت دی ہے اور ان تمام باتوں سے بچیں جنھیں منع کیا گیا ہے۔ کیوں کہ اگر مسلمان ہوتے ہوتے ہم نے وہ کام کیے جنھیں اللہ نے منع کیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم شیطان کے کہنے پر چل رہے ہیں اور یہ بُری بات ہوگی۔ اس سے یہ بھی ہوگا کہ ہم میں اور ان لوگوں میں فرق باقی نہیں رہے گا جو مسلمان نہیں ہیں۔ ہماری پہچان تو اسی سے ہے کہ ہم مسلمان ہیں اور ایک ملت ہیں۔ اگر ہم اللہ کے بتائے ہوئے راستے پر نہیں چلیں گے تو ہماری یہ پہچان ختم ہو جائے گی۔

اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ ہم اس دنیا میں زندگی بسر کرتے وقت یہ بات ہمیشہ یاد رکھیں کہ ہم یہاں جو کچھ کریں گے اس کا بدلا ہمیں دوسری دنیا میں ملے گا۔ یہ دنیا تو امتحان کے کمرے کی طرح ہے کہ جیسا پرچہ ہم حل کریں گے ویسے نمبر ہمیں ملیں گے۔ اس دنیا میں اگر ہم اچھے کام کریں گے تو دوسری دنیا میں اس کا بدلا اچھا ملے گا۔ بُرا کام کریں گے تو اس کی سزا ضرور ملے گی۔ اس لیے اس دنیا میں زندگی گزارتے وقت ہمیں کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہیے جس کو اللہ نے منع کیا ہے۔ یہ اللہ کا اپنے بندوں پر حق ہے۔ اللہ کے حق کی طرح بندوں کے بھی کچھ حق ہیں، ان کا بھی ہمیں ہر وقت خیال رکھنا چاہیے۔ دنیا میں اس طرح زندگی گزارنے سے جس میں اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق کا پورا پورا خیال رکھا جائے ہم ایک پاک اور صاف ستھرا معاشرہ پیدا کر سکتے ہیں۔ اس معاشرے میں امن اور چین ہوگا، کسی کے ساتھ زیادتی نہیں ہوگی۔ لوگ ایمان داری سے کام کریں گے، علم اور علم والوں کی عزت ہوگی اور لوگوں کا اخلاق اور کردار اچھا ہوگا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ انسان کو انسان سمجھا جائے گا۔ اس معاشرے میں چھوٹائی اور بڑائی کا کوئی فرق نہیں ہوگا، سب کے ساتھ انصاف ہوگا۔ اس معاشرے کی خوبی یہ ہوگی کہ لوگ مطمئن ہوں گے اور ایک دوسرے پر بھروسا کریں گے۔

ہمارے نبیؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

"دنیا تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے تمہارے لیے ہے۔ تم اس سے فائدہ اُٹھاؤ مگر دنیا کے ہو کر نہ رہ جاؤ۔ یہ سمجھ کر دنیا میں رہو کہ اصلی زندگی وہ ہے جو اس دنیا کی زندگی کے بعد آنے والی ہے اور وہی ہمیشہ رہنے والی ہے۔ دنیا میں اگر ہم اچھے کام کریں گے اور اللہ اور رسولؐ کا کہا مانیں گے تو آخرت کی زندگی میں کام یاب رہیں گے۔ اور اگر اس زندگی میں اللہ کا کہا نہ مانا تو اس زندگی میں ناکام رہیں گے۔

آخر میں اللہ کے رسولؐ کی ایک اور بات سن لیجیے جو اس دنیا کی زندگی کے بارے میں ہمارے لیے ایک نصیحت ہے۔ حضورؐ فرماتے ہیں:

"دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔"

یعنی جیسا یہاں بوؤ گے ویسا ہی وہاں کاٹو گے۔

اسلام مسلمانوں سے کیا چاہتا ہے

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے تمام انسانوں کو اللہ کا پیغام سنایا اور خود اُس پر پوری طرح عمل کر کے دکھایا۔ اللہ کا یہ پیغام آخری پیغام ہے جو اللہ کے آخری رسول اور پیارے بندے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے بھیجا گیا۔ قرآن پاک اللہ کا پیغام ہے اور جب تک یہ دنیا قائم ہے اس وقت تک کے لیے ہے۔ اب نہ کوئی پیغمبر آئے گا اور نہ اللہ کا کوئی پیغام۔

قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ بتایا ہے کہ رسول اللہؐ کی ذمّے داریاں کیا ہیں۔ ایک جگہ فرمایا:

"آپ لوگوں کو اللہ کی آیات سناتے ہیں، ان کو پاک وصاف کرتے ہیں اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔" (الجمعہ: ۲)

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ کے رسولؐ کا بس یہی کام تھا یا اللہ نے آپؐ کو کسی اور بڑے مقصد کے لیے بھیجا تھا۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ اللہ نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور سچّا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ وہ اس طریقۂ زندگی، یعنی اسلام کو دنیا کے تمام دوسرے طریقوں پر غالب کر دے۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ کے رسولؐ کا کام محض مسلمانوں کو تعلیم دینا اور ان کی تربیت کرنا ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر تعلیم و تربیت کے ذریعہ سے ایک ایسی جماعت تیار کرنا ہے جو آپؐ کے بتائے ہوئے راستے پر چلے اور آپؐ کی دی ہوئی تعلیم پر عمل

کرے، کیوں کہ اب دنیا میں کسی اور پیغمبر کو نہیں آنا تھا۔ لہٰذا کوئی نہ کوئی اور انتظام کرنا ضروری تھا جس سے اللہ کا وہ پیغام جو اس نے اپنے آخری نبی کے ذریعہ سے بھیجا تھا لوگوں تک پہنچتا رہے اور ایسے لوگ دنیا میں ہمیشہ موجود رہیں جو یہ کام کرتے رہیں۔

چناں چہ قرآن پاک میں مسلمانوں سے فرمایا گیا:

"تم بہترین اُمّت ہو جسے لوگوں کی راہ نمائی کا کام سونپا گیا ہے۔"

(آلِ عمران: ۱۱۰)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام مسلمانوں سے دو باتیں چاہتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ خود حضورؐ کی دی ہوئی تعلیم کے مطابق زندگی گزاریں اور دوسرے یہ کہ لوگوں کی ہدایت اور راہ نمائی کا فرض ادا کریں۔ گویا وہ اسلامی اصولوں پر عمل کر کے دنیا کے سامنے ایک نمونہ پیش کریں اور دوسروں کو اس پر عمل کرنے کو کہیں۔ اللہ نے مسلمانوں کے لیے یہ لازمی قرار دیا ہے کہ وہ لوگوں کو اچھی باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے روکیں۔ ان سے صرف یہ نہیں کہا گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بُرائیوں سے دور رکھیں، بلکہ لوگوں کو بُرائیوں سے بچانا بھی ان کا فرض ہے۔ یہی کافی نہیں کہ وہ خود کفر اور شرک سے بچیں، بلکہ ان کے لیے لازم ہے کہ دوسرے انسانوں کو بھی کفر اور شرک سے بچائیں۔ راہب اور سادھو بن کر دنیا سے الگ تھلگ رہنا ان کا کام نہیں ہے۔ اسلام تو ان سے چاہتا ہے کہ وہ دنیا میں پھیلی ہوئی بُرائیوں سے بچیں، بُرے کاموں سے دور رہیں اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کو بھی بُرائیوں سے بچائیں اور اچھے کاموں کی ترغیب دیں۔ اسی کو اسلام کہتے ہیں اور یہی سچا ایمان ہے۔ مسلمانوں کا یہ بھی فرض ہے کہ جن کاموں کے کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے اُن کو ٹھیک اسی طرح کریں۔ عبادت ہو یا دنیا کے معاملات ان کا عمل صحیح ہو۔ وہ لوگوں کو اچھی باتوں کی طرف بلائیں اور بُرائیوں کو مٹائیں۔

مسلمانوں کو یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ دنیا میں کم زوروں اور مجبوروں کی طرح رہنا ان کی شان کے خلاف ہے۔ اس طرح رہ کر وہ اپنے دنیاوی فرائض ادا نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے فرمایا ہے:

"اگر تم ایمان کی شرط پوری کرو گے تو سر بلند رہو گے۔"

اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے۔ جب تک مسلمانوں کے ہاتھ میں طاقت نہیں آئے گی، وہ نہ لوگوں کو اچھے کام کرنے کو کہہ سکیں گے اور نہ انھیں بُرے کاموں سے روک سکیں گے۔

اللہ کا شکر ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان اب ایک دوسرے کے قریب ہوتے جا رہے ہیں اور اللہ کے اس حکم کا مطلب ان کی سمجھ میں آگیا ہے:

"اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور آپس میں پھوٹ نہ ڈالو۔"

اور اب وہ یہ بھی سمجھنے لگے ہیں کہ دنیا کی کسی طاقت پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا اور نہ وہ ان کی دوست ہو سکتی ہے۔ ان کا بھروسا تو صرف اللہ پر ہونا چاہیے۔ اللہ پر ایمان آپس میں اتحاد اور دنیا میں سر بلندی حاصل کرنے کے لیے وسائل پر قابو ان کی اصل ضرورتیں ہیں۔ اگر مسلمان ایک ہو جائیں اور سائنس اور ٹکنالوجی پر توجہ دیں تو تھوڑے ہی عرصے میں وہ ایک بہت بڑی طاقت بن سکتے ہیں۔ اس وقت وہ زیادہ اچھی طرح اسلام کا پیغام دنیا تک پہنچا سکتے ہیں اور لوگ ان کی بات توجہ اور غور سے سُنیں گے۔ اسلامی کردار اور اخلاق کے ساتھ اگر طاقت بھی ہو تو پھر کوئی کمزور نظام ان کے آگے ٹک نہیں سکتا۔ حق آئے گا اور پوری طاقت سے آئے گا اور بُرائی مٹ کر رہے گی۔ اس لیے کہ دنیا میں امن اور چین کے لیے بُرائی کو مٹ ہی جانا چاہیے۔

قرآن پاک میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے اسے تلاش کرو، محنت کرو، ترقی تحقیق جاری رکھو۔ جب تک مسلمان قرآنِ پاک سے راہ نمائی حاصل کرتے رہے وہ تلاش اور تحقیق، تعمیر اور ترقی میں سب قوموں سے آگے رہے۔ آج دنیا نے جو ترقی کی ہے اور انسان جس طرح چاند تک پہنچا ہے وہ سب اسی محنت اور تلاش کا نتیجہ ہے جو مسلمانوں نے علم اور فن کے میدان میں کی۔ مگر آج کا مسلمان قرآن سے دور ہے اور اسی لیے پیچھے ہے۔ اس کی غفلت کی وجہ سے دنیا میں بڑی طاقتیں وجود میں آئی ہیں۔ حالانکہ بڑی طاقت تو خود مسلمان کو ہونا چاہیے

تھا۔ قرآن میں مسلمان کا یہی مقام ہے۔

اللہ ہمیں اس قابل کرے کہ ہم قرآن کی تعلیم پر عمل کریں اور دنیا میں عزت اور بڑائی حاصل کریں۔

رسولُ اللہؐ کی اطاعَت

قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے دنیا میں نبیوں کو اس لیے بھیجا ہے کہ ان کی اطاعت اور فرماں برداری کی جائے۔ رسولؐ کی فرماں برداری اور اطاعت کے بغیر اللہ سے تعلق قائم نہیں ہو سکتا۔

ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، اللہ کے آخری نبی ہیں۔ اس لیے ان کی اطاعت ہی سے ہمیں ہدایت حاصل ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ حضورؐ کو چھوڑ کر کوئی اور وسیلہ ڈھونڈا جائے یا کسی اور مذہب کی پیروی کی جائے۔ قرآنِ پاک میں اسی لیے بار بار حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت اس وقت تک قبول ہو ہی نہیں سکتی۔ جب تک اللہ کے پیارے رسول، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور فرماں برداری نہ کی جائے۔

یہ بات یوں بھی سمجھ میں آنے والی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت رسول اللہؐ ہی کے ذریعہ سے انسانوں تک پہنچی ہے۔ انھوں نے ہی یہ بتایا ہے کہ قرآنِ مجید اللہ کا کلام ہے۔ اگر حضورؐ نہ آتے تو ہمیں یہ کیسے معلوم ہوتا کہ اللہ ایک ہے، اس کا کوئی ساتھی نہیں اور وہ اپنے بندوں سے کیا چاہتا ہے۔ پھر یہ بات بھی سمجھنے کے لائق ہے کہ اللہ کے رسولؐ کا کام صرف اللہ کا پیغام پہنچا دینا ہی نہ تھا بلکہ آپؐ ہمارے رہبر بھی ہیں اور آپؐ کے ہر قول و عمل میں ہمارے لیے ایک ہدایت ہے۔ چوں کہ حضورؐ

جو کچھ بھی فرماتے تھے اور کرتے تھے وہ سب اللہ کے حکم کے مطابق ہوتا تھا اس لیے حضورؐ کی اطاعت کرنا در حقیقت اللہ ہی کی اطاعت کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جو یہ فرمایا ہے کہ رسولؐ جو ہدایت تمھیں دیں قبول کر لو، اس پر عمل کرو، اور جن باتوں سے روک دیں ان سے رُک جاؤ تو اس کا مطلب یہی ہے۔

اسی طرح سورۃ نجم میں فرمایا ہے کہ رسول اللہؐ اپنی مرضی سے کوئی بات نہیں کہتے بلکہ صرف وہی کہتے ہیں جو اللہ ان سے کہتا ہے۔

پھر ایک جگہ اور فرمایا ہے کہ جس نے رسولؐ کی اطاعت کی تو اس نے اللہ کی اطاعت کی۔ اس کا مطلب بالکل واضح ہے یعنی یہ کہ جس نے رسولؐ کی نافرمانی کی اس نے گویا اللہ کی نافرمانی کی اور جیسا کہ قرآن نے کہا ہے جس نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کی وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔

اس بات کو یوں سمجھنا چاہیے کہ اگر کوئی شخص حکومت کے افسر کی نافرمانی کرتا ہے تو اسے حکومت کی نافرمانی سمجھا جاتا ہے، کیوں کہ وہ حکومت کا مقرر کیا ہوا ہوتا ہے اور اسی کے حکم کے مطابق کام کرتا ہے۔ جب اللہ نے صاف طور پر یہ کہہ دیا ہے کہ میرے رسولؐ کی اطاعت کرو تو اب جو رسولؐ کی اطاعت نہیں کرے گا وہ گویا خود اللہ کی نافرمانی کرے گا۔ ہمارے سامنے شیطان کی مثال ہے۔ اللہ نے جب حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو شیطان نے یہ کہہ کر سجدہ کرنے سے انکار کر دیا کہ آدم مٹی سے بنے ہیں اور میں آگ سے۔ اس وجہ سے میں ان سے بہتر ہوں۔ حالانکہ بات یہ نہیں تھی کہ کون بہتر ہے اور کون کم تر، بلکہ سوال اللہ کے حکم کو ماننے کا تھا۔ شیطان نے سجدہ کرنے سے انکار کر کے اللہ کی نافرمانی کی اور اسی وجہ سے اس پر اللہ کی پھٹکار ہوئی۔ اسی طرح جب اللہ نے یہ حکم دیا ہے کہ رسولؐ کی اطاعت کرو تو یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم دل سے رسولؐ کی اطاعت کریں۔ اگر نہیں کریں گے تو یہ سخت گناہ ہوگا۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ رسولؐ کی اطاعت اور فرماں برداری کے بغیر اللہ کی محبت حاصل نہیں ہو سکتی۔ قرآنِ پاک میں ارشاد ہے:

"اے رسولؐ آپ لوگوں سے کہہ دیجیے کہ تم اللہ کی محبت کا دم بھرتے

ہو تو میری اطاعت کرو۔"

حضورؐ کی زندگی ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ جو شخص جتنا زیادہ حضورؐ کے نقشِ قدم پر چلے گا اتنا ہی زیادہ وہ اللہ کو پسند ہوگا۔ رسول اللہؐ کے صحابی اس بات کو خوب اچھی طرح سمجھ گئے تھے۔ اسی لیے جب حضورؐ انھیں کوئی بات سمجھانے کے لیے سوال کے طور پر کچھ فرماتے تو وہ بہت ادب سے عرض کرتے کہ اللہ کے رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔ وہ حضورؐ کی باتیں بہت توجّہ سے سنتے، انھیں یاد رکھتے ہیں اور ان پر عمل کرتے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآنِ پاک میں صاف فرمادیا ہے کہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتے جب تک کہ وہ اپنے آپس کے اختلافات میں اللہ کے رسولؐ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں اور پھر وہ جو فیصلہ کریں اس پر اپنے دل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ خوشی خوشی اسے تسلیم کرلیں۔

رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا اسوۂ حسنہ ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔ ہمیں اس کی پوری پوری پیروی کرنی چاہیے۔ یہی حضورؐ کی فرماں برداری کا تقاضا ہے۔ جو باتیں آپؐ کو پسند تھیں نہ ہمیں بھی پسند ہونی چاہییں اور جو باتیں آپ کو ناپسند تھیں وہ ہمیں بھی ناپسند ہونی چاہییں۔ حضورؐ کا فرمان تھا کہ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔ اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم ہر مسلمان کو اپنا بھائی سمجھیں۔ آپؐ یتیموں پر شفقت، بیواؤں کی سرپرستی اور محتاجوں کی مدد فرماتے تھے۔ یہی تمام اچھی باتیں ہمیں بھی اپنانی چاہییں۔ اس دنیا میں ہمارے لیے اچھے عمل کا نمونہ ہمارے نبیؐ ہیں آپؐ کے سوا کوئی دوسرا نہیں۔

رسول اللہؐ حاکم کی حیثیت سے

رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم کی پاک زندگی ہر مسلمان کے لیے عمل کا بہترین نمونہ ہے۔ اس دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے ہر مسلمان کو انفرادی اور اجتماعی دونوں حالات میں حضورؐ کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ حضورؐ دنیا میں آخری نبی کی حیثیت سے ہر طرح سے ایک کامل انسان کا نمونہ بنا کر بھیجے گئے تھے۔ آپؐ نے اپنی امت کو صرف عبادت کا طریقہ ہی نہیں بتایا بلکہ آپؐ نے خود عمل کرکے یہ بتادیا کہ دنیا میں زندگی کس طرح گزارنی چاہیے۔ اس کے بعد ہمیں رہنمائی کے لیے کسی اور جانب دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اگر دنیا حضورؐ کے بتاتے ہوئے طریقے پر چلے اور آپؐ کی دی ہوئی ہدایات پر عمل کرے تو وہ آج جس پریشانی اور انتشار میں پھنسی ہوئی ہے اس میں مبتلا نہ ہو۔

ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ آپؐ جس طرح ایک شفیق باپ اور ایک محبت کرنے والے شوہر تھے اسی طرح امت کے حاکم اور سربراہ بھی تھے۔ جس طرح آپؐ نے بندے کو اللہ کی بندگی کا طریقہ بتایا، بندوں کے دل ایک دوسرے سے جوڑے، انصاف قائم کیا اور ایک پاک اور صاف ستھرا معاشرہ تشکیل دے کر دنیا کو ایک مضبوط نظام عطا کیا اس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ہے۔

ایک حاکم اور سربراہ کی حیثیت سے حضورؐ کا بہترین عمل نہ صرف ہمارے لیے روشنی کا ایک مینار ہے بلکہ ساری انسانیت کے لیے ایک آئیڈیل ہے۔ حضورؐ نے صاف الفاظ میں فرمایا کہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں کے معاملے میں بڑے اور چھوٹے، امیر اور غریب

کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ سب پران حدوں کی پابندی لازمی ہے۔ آپؐ نے فرمایا:

"تم سے پہلی امتیں اسی لیے ہلاک ہوئیں کہ ان میں سے جب کوئی عزت والا چوری کرتا تو اس کو سزا نہیں دیتے تھے۔ قسم اللہ کی اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرے تو اس کا ہاتھ کاٹ ڈالوں۔"

حضورؐ نے یہاں ایک نہایت اہم نکتہ بیان فرمایا ہے اور وہ یہ کہ جرم اور غلطی کی سزا ہر حال میں ہے اور اس میں کسی رعایت یا امتیاز کا سوال نہیں۔ جرم کرنے والا کوئی ہو کسی خاندان کا آدمی ہو، کیسا ہی اثر والا ہے، کیسا ہی دولت مند ہو، اگر قانون کی خلاف کرے گا تو سزا پائے گا۔ اس طرح حضورؐ نے معاشرے کو انصاف اور برابری کی ایسی بنیاد عطا کردی جس سے معاشرے کو امن اور استحکام حاصل ہوتا ہے۔

تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے اور اب بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ بادشاہ اور حکمراں لوگوں پر اپنی حکومت اور اپنی طاقت کا رعب بٹھانے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں کہ وہ ان کے سامنے آتے ہوئے کانپتے ہیں۔ یہ بادشاہ اور حکمراں اپنے ارد گرد ایسی شان و شوکت کا ماحول پیدا کرتے ہیں کہ لوگ دیکھ کر ڈر جائیں۔

لیکن ہمارے سرکارؐ کو ان تمام ظاہری چیزوں کی پروا نہ تھی۔ سارے عرب کی حکومت آپؐ کے قدموں میں تھی لیکن ایک پھٹا ہوا بوریا آپؐ کا بستر تھا۔ بڑے بڑے حکمراں اور طاقت ور سردار آپؐ کے غلام تھے لیکن آپؐ کا دربار ہر قسم کی شان و شوکت سے خالی تھا۔ اس کے باوجود حضورؐ کا رعب اور دبدبہ سب سے بڑھ کر تھا۔ ایک آدمی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور آپؐ کے رعب سے اس پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ آپؐ اس کو تسلی دیتے ہیں اور اس کے دل سے خوف اور ہیبت دور کرنے کے لیے اس سے فرماتے ہیں۔

"ڈرو نہیں۔ میں قریش کی ایک غریب عورت کا بیٹا ہوں جو سوکھا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی۔"

آپؐ کے یہ الفاظ انسانی عظمت کا منشور ہیں اور آزادی اور برابری کے بڑے بڑے دعوے داروں کے لیے ایک سبق ہیں۔ حضورؐ نے اس طرح یہ بتا دیا کہ عزت اور بڑائی اچھے کردار، اخلاق، علم اور خدمت سے ہے، عہدے یا دولت سے آدمی بڑا نہیں ہو جاتا۔

ایک سربراہ کے لیے ضروری ہے کہ اس کی زبان میٹھی ہو، وہ اپنے ساتھیوں سے محبت کرے، انھیں کم تر نہ سمجھے، ان کی عزت بڑھائے۔ حضورؐ اپنے معمولی سے معمولی ماتحتوں کے ساتھ برابر کام کرتے۔ ایک بار حضورؐ اپنے ساتھیوں کے ساتھ سفر پر تشریف لے گئے اور سفر کے دوران ساتھیوں کو بکری بھوننے کا حکم دیا۔ ایک صاحب نے کہا یا رسول اللہ، میں اس کو ذبح کروں گا، دوسرے نے کہا، میں اس کا گوشت تیار کروں گا، تیسرے نے کہا، میں اس کو پکاؤں گا۔

حضورؐ جو امّت کے سربراہ تھے، فرمایا، "اور جنگل سے لکڑیاں میں لاؤں گا۔"

حضورؐ کے صحابیوں نے عرض کیا، "یا رسول اللہؐ ہم جو حاضر ہیں۔"

حضورؐ نے فرمایا: "ٹھیک ہے لیکن مجھے یہ پسند نہیں کہ سب کام کریں اور میں الگ بیٹھا رہوں۔ اللہ کو یہ بات پسند نہیں کہ کوئی شخص اپنے ساتھیوں میں بڑا بننے کی کوشش کرے۔"

قوم کے حاکم کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے دل میں دوسروں کے لیے ہمدردی ہو۔ حضورؐ اس معاملے میں بھی بے مثال تھے۔ لوگوں کے دکھ درد کا بے حد خیال رکھتے تھے۔ آپؐ کا ارشاد ہے کہ اللہ کے عذاب سے بچنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ آدمی ضرورت کے وقت لوگوں کے کام آئے۔

مشورہ کرنا ملّت کے سربراہ کے لیے مفید ہی نہیں لازمی ہے۔ حضورؐ نے نہ صرف مشورے کا حکم دیا ہے بلکہ خود اس پر عمل بھی کرتے تھے۔ خصوصاً اجتماعی معاملات مشورے کے بغیر طے نہیں کرتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ، سے روایت ہے کہ ایک بار انھوں نے حضورؐ سے عرض کیا:
"یا رسول اللہ آپ کے بعد اگر کوئی معاملہ ایسا پیش آجائے جس کے متعلق نہ قرآنِ حکیم میں کچھ اترا ہو اور نہ آپؐ سے کوئی بات سنی گئی ہو تو ہم کیا کریں؟"

آپؐ نے فرمایا: "میری امّت میں سے عبادت گزار اور فرماں بردار لوگوں کو جمع کرو اور اس معاملے کو مشورے کے لیے سامنے رکھ دو اور کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔"

خود حضورؐ کا عمل بھی یہی تھا۔ آپؐ اللہ کے اس حکم کی کہ:

"شَاوِرْهُمْ فِی الْأَمْرِ" (آلِ عمران: ۱۵۹)

پوری تعمیل فرماتے تھے اور صحابہ کرامؓ کے مشورے سے ملّت اور حکومت کے فیصلے کرتے تھے۔

حضورؐ اس بات کا بھی خاص خیال رکھتے تھے کہ جن لوگوں کو مسلمانوں کے انتظامی معاملات سونپے جائیں وہ اہل اور اعتماد کے قابل ہوں اور لوگ انھیں پسند کرتے ہوں۔ حضورؐ کا ارشاد ہے:

"تمھارے بہترین امام اور قائد وہ ہیں جن کو تم چاہتے ہو اور وہ تم کو چاہتے ہوں تم ان کو دعائیں دیتے ہو اور وہ تم کو دعائیں دیتے ہوں اور تم میں بدترین رہنما وہ ہیں جن کو تم ناپسند کرتے ہو اور وہ تم کو ناپسند کرتے ہوں اور وہ تم پر لعنت بھیجتے ہوں اور تم ان پر لعنت بھیجتے ہو۔"

غرض مختصراً یہی کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے تدبّر، انصاف، مشورہ، ہمدردی، محبت، خدمت، ہر دل عزیزی اور سادگی کے ایسے اصول اپنے عمل سے عطا کیے جو ملکوں اور قوم کے سربراہوں اور حکمرانوں کے لیے ہمیشہ ایک روشن مثال بنے رہیں گے۔

اللہ کا ڈر

انسان دو ہی وجہ سے کوئی کام کرتا ہے۔ ڈر سے یا محبت سے۔ ان دونوں کے نتیجے الگ الگ ہوتے ہیں۔ کبھی محبت کا دعوا ہوتا ہے تو کبھی کبھی نافرمانی اور گستاخی ہو جاتی ہے۔ جس سے محبت کی جاتی ہے اس پر بہت زیادہ اعتماد کی وجہ سے محبت کرنے والا اس کے احکام سے غافل بھی ہو جایا کرتا ہے۔ اس لیے جس کردار کی تعمیر محض محبت کی بنیاد پر ہوگی اس میں توازن نہیں ہوگا۔ اسلام ایک ایسا دین ہے جس میں ہر معاملے میں توازن پر زور دیا گیا ہے۔ سچ پوچھیے تو ہماری زندگی کے پورے نظام کی روح ہی انصاف اور توازن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ قرآن پاک مومنوں کے دلوں کو اللہ تعالیٰ کی محبت سے بھرا دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کی رحمت، اس کی قدرت، اس کی روزی رسانی، اس کی نعمتوں اور اس کے فضل وکرم کا تقاضا ہی یہ ہے کہ بندہ اپنے آقا سے محبت کرے۔ لیکن یہ نعمتیں عطا کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے کچھ فرائض بھی مقرر کیے ہیں، کچھ باتوں کے کرنے کا حکم دیا اور کچھ سے دور رہنے کی ہدایت کی ہے۔ یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں۔

قرآن چاہتا ہے کہ سارے انسان، خاص طور پر وہ لوگ جو ایمان کا دعوا رکھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی مقرر کی ہوئی ان حدوں کے اندر رہ کر زندگی بسر کریں۔ وہ سچ بولیں، اچھے کام کریں، بُرے کاموں سے بچیں۔ ان کے اخلاق اچھے ہوں، ان کا کردار پسندیدہ ہو۔ یہ کیفیت صرف اللہ کی محبت کے جذبے سے نہیں پیدا ہوگی،

بلکہ اس کے ڈر سے پیدا ہوگی۔ اس لیے قرآن پاک میں جہاں مومنوں کے اوصاف
گہری محبت کا ذکر آیا ہے وہیں یہ بھی کہا گیا ہے:

"اور وہ اس کے خوف سے ڈرے رہتے ہیں"

(الانبیا: ۲۸)

یعنی صرف ڈرتے ہی نہیں، بلکہ کانپتے رہتے ہیں۔ ایسا خوف اللہ کی عظمت اور اس کی بڑائی کے صحیح تصور ہی سے پیدا ہوتا ہے۔ جس شخص کو یہ احساس ہوگا کہ اسے اللہ کے سامنے جواب دینا ہے، جو سزا اور جزا پر پکا یقین رکھتا ہوگا، جو یہ جانتا ہوگا کہ اللہ معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی پکڑ بھی سخت ہے، وہ اپنے بندوں پر کرم کرتا ہے تو سزا بھی دیتا ہے، وہ عطا کرتا ہے تو چھین بھی لیتا ہے، وہ یقیناً اس سے محبت بھی کرتا ہوگا اور اس سے ڈرتا بھی ہوگا۔

اللہ سے ڈر اور خوف کو قرآن نے مومنوں کی ایک صفت ہی نہیں قرار دیا ہے بلکہ اس کی تاکید بھی کی ہے

"مجھ سے ڈرو اگر حقیقت میں تم صاحب ایمان ہو"

(آل عمران: ۱۷۵)

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ڈر کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہے جو اللہ سے نہیں ڈرتا وہ بڑے سے بڑا گناہ کر سکتا ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین سے معاشرے میں نظم و ضبط تو پیدا ہوتا ہے اور سزا کے نظام سے معاشرہ کسی حد تک جرائم سے محفوظ بھی رہتا ہے لیکن ان قوانین کے باوجود جرائم نہ صرف ہوتے رہے ہیں بلکہ بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ ہر طرح کی بے راہ روی اور لاقانونیت پھیلی ہوئی ہے۔ غیر مسلم معاشروں میں اگر لوگوں کے کردار کمزور ہیں تو تعجب نہیں، لیکن اسلام کا دعوا کرنے والی جماعتوں میں اگر اللہ کے احکام کی کھلی خلاف ورزی کی جا رہی ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہمارا ایمان ہی کمزور ہے اور ہمیں اللہ تعالیٰ کی عظمت کا اور قیامت میں اس کے سامنے جواب دہی کا پورا احساس نہیں ہے۔ اسی

لیے قرآنِ پاک میں اللہ کے خوف کو علم کا نتیجہ کہا گیا ہے:

"اللہ کے بندوں میں صرف علم رکھنے والے لوگ ہی اس سے ڈرتے ہیں۔"

(الفاطر: ۲۸)

یہ بات یہاں سمجھ لینی چاہیے کہ علم سے مراد اللہ تعالیٰ پر پورا ایمان اور پکا یقین ہے، یعنی ایمان اور یقین کی ایسی کیفیت کہ ہماری باتوں سے، ہمارے کاموں سے، ہمارے سوچنے سے، ہمارے لوگوں کے ساتھ برتاو سے، ہمارے اخلاق سے، ہماری عبادت سے، غرض ہمارے ہر عمل سے یہ ظاہر ہو کہ ہم اللہ سے ڈرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر آپ کسی کے بارے میں یہ اچھی طرح نہ جانتے ہوں کہ اس میں کتنی طاقت ہے تو آپ اس سے کس طرح ڈریں گے۔ ہاں اگر آپ کو اس کی طاقت اور قوت کا صحیح علم ہو جائے تو آپ کے ڈر کی حالت ہی کچھ اور ہو گی۔ اسی لیے علم رکھنے والے اور ایمان رکھنے والے ہی اللہ سے اس طرح ڈرتے ہیں جیسا کہ ڈرنا چاہیے۔

قرآن پاک میں ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:

"اور تم مجھ ہی سے ڈرو۔"

(البقرہ: ۴۱)

یعنی یہ کہ ڈرنے کے لائق ذات صرف اللہ کی ہے۔ ایک مومن اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا، کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ سارے انسان اُس کی طرح اللہ کے محتاج ہیں، اسی کے سوا کسی میں نفع نقصان پہنچانے کی طاقت نہیں، موت اور زندگی اس کے سوا کسی کے ہاتھ میں نہیں، اس کے سوا نہ کوئی دے سکتا ہے اور نہ چھین سکتا ہے۔

اسی احساس سے اس کی زندگی میں ایک نمایاں تبدیلی آجاتی ہے۔ اسی لیے قرآنِ پاک میں تاکید کی گئی ہے کہ اللہ سے ڈرو اور اس کو ایمان کا تقاضا قرار دیا گیا ہے۔

اللہ سے ڈرنے کا مطلب یہ بھی ہے کہ انسان ان چیزوں کی خواہش نہ کرے، جنھیں اللہ پسند نہیں کرتا۔ اپنے ہر قول اور عمل میں اسے یہ خوف رہے کہ مجھے ایک دن اللہ کو جواب دینا ہے۔ خوف کا ایک مقام اور بھی ہے اور وہ اس کے نیک بندوں کے لیے ہے جو ہر وقت اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہتے ہیں کہ کہیں ان سے کوئی غلطی نہ

ہو جائے جس کی وجہ سے وہ اللہ کی نظروں سے گر جائیں اور جو نعمتیں ان کو ملی ہیں وہ چھن جائیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اللہ کی دی ہوئی ہر چیز ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ کیا یہ نعمت نہیں ہے کہ اس نے ہمیں ایمان کی دولت عطا کی، ہمیں بہترین اُمت قرار دیا، ہماری ہدایت کے لیے اپنے آخری نبیؐ کو بھیجا اور قرآن پاک نازل کر کے ہمیں زندگی کا ایک پورا نظام عطا کر دیا۔

اب ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے ان احسانات کا شکر ادا کرتے رہیں اور اس کے ساتھ ساتھ ڈرتے بھی رہیں کہ کہیں ہماری کسی خطا کی وجہ سے یہ نعمتیں ہم سے چھین نہ لی جائیں۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں تاکید کی ہے:

"اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ ڈرنے کا حق ہے۔ تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔"

(آل عمران: ۱۰۲)

اللہ کا شکر

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ انسان کو جو نعمتیں عطا کی گئی ہیں وہ اتنی ہیں کہ اگر کوئی انھیں گننے بیٹھے تو نہیں گن سکتا۔ سورۂ ابراہیم میں ان نعمتوں اور اللہ تعالیٰ کے احسانات کی تفصیل بتائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اس نے انسان کو ہر وہ چیز عطا کی ہے جس کی اسے ضرورت اور خواہش ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے جسم کا رُواں رُواں اللہ تعالیٰ کے احسانات سے دبا ہوا ہے۔ اپنی زندگی کے ہر لمحے میں ہم اس کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان نعمتوں کے علاوہ ایک اور بڑا احسان جو اللہ نے ہم پر کیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے اس زمین پر ہمیں اپنا نائب اور خلیفہ بنایا ہے اور مسلمان کی حیثیت سے ہمیں دنیا میں اللہ کی بادشاہت قائم کرنے کا اہل بنایا ہے۔ اس مقصد کے لیے اس نے قرآن پاک کی شکل میں ہدایت دی ہے۔

باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"لوگو! تمھارے پاس تمھارے رب کی نصیحت آگئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو دلوں کی بیماریوں کی شفا ہے اور جو اسے قبول کرلیں ان کے لیے رہنمائی اور رحمت ہے۔ یہ محض اللہ کا تم پر فضل ہے، ایسا فضل جس کے ملنے پر خوشی منانی چاہیے۔"

(یونس: ۵۷-۵۸)

اللہ تعالیٰ کے اس احسان اور کرم کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہماری زندگی کا ہر ہر لمحہ اس کا شکر ادا کرنے میں گزرے، لیکن انسان کے لیے اپنی فطری کمزوریوں اور مادی ضرورتوں کی وجہ سے ایسا کرنا ممکن نہیں۔ اگر ممکن بھی ہو تو بھی اس کی زندگی کا عرصہ اتنا ناکافی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احسانات کا حق اور اس کی نعمتوں کا شکر پوری طرح ادا نہیں کرسکتا۔ اللہ کے احسانات کا شکر ادا کرنا تو انسان کے بس سے باہر ہے، لیکن وہ اِن نعمتوں اور احسانات کا اعتراف اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور فرماں برداری کرکے کرسکتا ہے۔ یہ اس کا فرض ہے۔ جو آدمی اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کے باوجود اس کی اطاعت نہیں کرتا اور اس کی بندگی اختیار نہیں کرتا وہ اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرتا ہے اور اس کی نعمتوں کا منکر ہے۔

قرآنِ پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

"اگر تم میری نعمتوں پر میری اطاعت کرکے شکر ادا کروگے تو میں تم پر مزید احسان کروں گا اور اپنی نعمتوں میں اضافہ کروں گا لیکن اگر تم نے میری ناشکری کی تو اس کی سخت سزا دوں گا۔"

(ابراہیم: ۷)

اگر ہم اپنے حالات پر غور کریں تو بات سمجھ میں آجاتی ہے۔ آج مشرق سے مغرب تک اور شمال سے جنوب تک انسان جن مصیبتوں میں گرفتار ہے کہیں یہ اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کے مطابق ناشکری کی سزا تو نہیں۔ خاص طور پر دنیا میں مسلمانوں کی جو ابتر حالت ہے اور جس ذلت و خواری میں ہم مبتلا ہیں کیا یہ ہماری نافرمانی اور ناشکری کا نتیجہ تو نہیں؟

ہم اپنی زندگی کے سب سے خطرناک دور سے گزر رہے ہیں۔ ہم نے اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت چھوڑ دی ہے اور پوری بے حیائی کے ساتھ اللہ سے بغاوت کی راہ پر چل رہے ہیں۔ ہماری زندگی اس طریقے کے مطابق بسر نہیں ہو رہی جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے ہمیں بتایا ہے۔ ہماری انفرادی زندگی ہو یا قومی، اس میں کہیں بھی اس ہدایت کا اثر نظر نہیں آتا جو اللہ اور اس کے رسولؐ نے دی ہے۔ مسلمان کی حیثیت سے

یہ ہمارا ایمان ہے کہ جب تک ہم اپنے اندر احسان مندی کے جذبات پیدا نہیں کریں گے اپنی کھوئی ہوئی عظمت اور عزت حاصل نہیں کر سکیں گے۔ اور یہ جذبات اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہم دل و جان سے اللہ کی فرماں برداری نہ کریں اور ہماری زندگی کے ہر عمل میں بندگی کا اظہار نہ ہو۔

اللہ کی رحمت اور اس کی مہربانی ہے کہ اس نے ہماری ساری کوتاہیوں کے باوجود ہمیں سنبھل جانے اور ناشکری چھوڑ دینے کا موقع دیا ہے جو کسی اور اُمّت کو نہیں دیا گیا۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنی ذاتی اور ملی حیثیت سے اپنی پستی پر افسوس کریں اور اس شرم ناک حالت سے کہ نہ ہم اللہ کے احسانات کا شکر ادا کرتے ہیں اور نہ ایک دوسرے کا، اپنے آپ کو نکالیں۔ اگر ہمیں عزت کے ساتھ زندہ رہنا ہے تو اپنا حال بدلنا ہوگا۔

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اللہ اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جو خود اپنی حالت بدلنے کا عزم نہ رکھتی ہو۔ اور اللہ جس قوم کے حق میں تباہی کا فیصلہ فرمادے تو پھر کوئی طاقت اس کے فیصلے کو نہیں روک سکتی اور اللہ کے سوا کوئی کام بنانے والا نہیں۔"

(الرعد: ۱۱)

اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے:

"آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمھیں خواہ مخواہ سزا دے۔ اگر تم شکر گزار بنے رہو اور ایمان کی روش پر چلو۔ اللہ تو بڑا ہی قدر دان ہے اور سب کے حال سے خوب واقف ہے۔"

سچّی بات یہ ہے کہ اللہ کا شکر زندگی کا حاصل ہے۔ اچھّے اخلاق کا تقاضا ہے کہ انسان احسان مند اور شکر گزار ہو۔ اللہ ہمیں اچھّے اخلاق عطا کرے، شکر کی توفیق دے اور سیدھے راستے پر چلائے۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنا

اسلام چاہتا ہے کہ ہمارے دل جہاں کفر، شرک اور نفاق سے پاک ہوں وہاں مال اور دولت کی محبت سے بھی پاک ہوں۔ کیوں کہ دولت ایک ایسی گرد ہے جو دل کے آئینے کو میلا کر دیتی ہے اور اس میں سچائی نظر نہیں آتی۔ اچھے کردار اور صاف ستھرے معاشرے کے لیے بھی ضروری ہے کہ ہمارا دل ان تمام برائیوں سے پاک ہو۔

جہاد کی دو قسمیں ہیں: جان سے اور مال سے۔ اسلام نے دونوں قسموں پر زور دیا ہے۔ مال سے جہاد کو قرآن ایک بہترین تجارت قرار دیتا ہے۔ جس طرح اچھی تجارت میں ہمیشہ نفع زیادہ اور یقینی ہوتا ہے اسی طرح اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے والے کو بڑا اجر اور یقینی ثواب ملتا ہے۔

اللہ کی راہ میں جو سرمایہ کاری کی جاتی ہے وہ منافع کے اعتبار سے دنیا کے دوسرے کاروبار سے بہت مختلف ہے۔ اس لیے قرآنِ پاک نے ہمیشہ مومنوں کو اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنے کی تاکید کی ہے۔ قرآنِ پاک میں ارشاد ہے:

"تم نیکی تک نہیں پہنچ سکتے جب تک اپنی وہ چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو جو تمھیں پسند ہیں۔" (آلِ عمران: ۹۲)

جو چیز انسان کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتی ہے وہ لالچ ہے اور کنجوسی کو جس طرح برا کہا گیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ایک مسلمان کبھی لالچی اور کنجوس نہیں ہو سکتا اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ دولت کی ہوس میں مبتلا ہو جائے، کیوں کہ وہ جانتا

ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے :

"پھٹکار ہو ہر غیبت کرنے والے اور عیب نکالنے والے پر جس نے دولت اکٹھی کی اور اس کو گن گن کر رکھا، سمجھتا ہے کہ یہ دولت اسے ہمیشہ رکھے گی۔"

(ہُمزہ : ۱-۲)

سچائی ہمیشہ سے جان و مال کی قربانی کا مطالبہ کرتی رہی ہے۔ جو آدمی مال و دولت کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے وہ سچائی کا راستہ اختیار کرنے سے اس لیے کتراتا ہے کہ اس کی دولت خرچ ہو جائے گی اور اس نے بڑی محنت سے جو مال حاصل کیا ہے وہ اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا اور وہ مفلس ہو کر رہ جائے گا۔ قرآنِ پاک اسے شیطانی وسوسہ قرار دیتا ہے۔ دراصل مال و دولت ایک آزمائش ہے۔ اس آزمائش میں کامیابی پہلی شرط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو آدمی کنجوسی اور لالچ سے بچ گیا وہی کامیاب ہوا کیوں کہ ہر اونچے مقصد کے لیے جان اور مال کی بازی لگانی ہی پڑتی ہے۔ نیک کاموں میں یا اللہ کی راہ میں خرچ کرنا آخرت کی کامیابی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

اسلام نے عبادات اور معاملات کے جو احکام دیے ہیں ان میں اجتماعی بھلائی کا پہلو ہے۔ ہر معاشرے میں غریب اور مجبور لوگ بھی ہوتے ہیں اور مال دار بھی۔ مال داروں کو اسلام یہ ہدایت کرتا ہے کہ وہ اپنے مال میں غریب اور مجبور لوگوں کا حق سمجھیں اور انھیں دینے میں کنجوسی نہ کریں۔

اسلام فیاضی اور سخاوت کی تعلیم اس لیے بھی دیتا ہے کہ دولت چند ہاتھوں میں جمع ہو کر نہ رہ جائے اور معاشرے کے تمام لوگ اس سے فائدہ اُٹھا سکیں اور ایک ہو کر بُرائی کا مقابلہ کر سکیں۔ اسلام نے فیاضی اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو آخرت کے تصور سے وابستہ کیا ہے اور مال کے بارے میں بنیادی طور پر یہ احساس دلایا ہے کہ یہ تمھارے لیے بھی ہے اور دوسروں کے لیے بھی۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق مال اور دولت ایک امانت ہے۔ اس لیے قرآن دولت کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی نہ صرف ترغیب دیتا ہے بلکہ یہ بھی واضح کر دیتا ہے کہ ایسا نہ کرنے والے سزا کے مستحق ہوں گے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے :

"تم کو کیا ہوا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ؟" (الحدید: ۱۰)

دراصل اسلام انسانوں میں یہ شعور پیدا کرنا چاہتا ہے کہ مال اور دولت کی زیادتی اور کمی دونوں برابر کی آزمایش ہیں۔ انسان اگر یہ سمجھتا ہے کہ اس کی کسی ذاتی خوبی یا کسی خاص ہنر کی وجہ سے دولت اس کی طرف سمٹی چلی آرہی ہے تو یہ اس کی نادانی ہے۔ اسے یقین کرنا چاہیے کہ یہ سب کچھ محض اللہ کا فضل ہے۔ وہی آسمان اور زمین کے خزانوں کا مالک ہے۔ جس طرح اور جیسے چاہے وہ دولت عطا کرے۔ اور جس سے جب چاہے اسے چھین لے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو یقین دلاتا ہے کہ تم میری راہ میں جو کچھ بھی خرچ کروگے، اس کا تمھیں پورا پورا بدلا ملے گا۔ کہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں خرچ کرنے کو قرض بھی کہا ہے اور فرمایا ہے کہ آخرت میں اس کا بدلا ہم بڑھا چڑھا کر ادا کر دیں گے۔ اس لیے وہ تاکید فرماتا ہے کہ موت سے پہلے نیک کاموں میں مال و دلت خرچ کرنے کا جو موقع مل گیا ہے اس سے آخرت کی بھلائی کے لیے فائدہ اُٹھالو۔

قرآنِ پاک مال خرچ کرنے کے اُصول بھی بتاتا ہے۔ پہلی چیز یہ کہ نیّت ٹھیک ہو یعنی مال خرچ کرنے کا مقصد اپنی شان دکھانا یا اپنی دولت کا اظہار کرنا نہ ہو، بلکہ صرف اللہ کی رضا اور اس کے حکم کی تعمیل ہو۔ دوسری چیز یہ کہ جس پر مال خرچ کیا جائے اس پر احسان جتا کر اس کو ایذا نہ پہنچائی جائے اور تیسری یہ کہ کمائی کا بہترین حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے۔

قرآن پاک نے مال خرچ کرنے کو اللہ کی قربت اور اس کے رسول ؐ کی دعاؤں کا ذریعہ قرار دیا ہے اور وعدہ فرمایا ہے کہ اللہ ایسے لوگوں کو اپنی رحمت میں داخل فرمائے گا اور جنّت ان کا ٹھکانا ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں نے اس حال میں بھی اللہ کی راہ میں خرچ کیا ہے جب خود ان کی اپنی ضرورتوں کے لیے بھی ان کے پاس پیسا نہیں تھا۔ ایسے ہی ایثار کرنے والے لوگوں کا قرآنِ پاک میں اس طرح ذکر آیا ہے:

"اپنی ضرورتیں روک کر دوسروں کے لیے ایثار کرتے ہیں چاہے خود بھوکے رہیں۔" (الحشر: ۹)

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضؓ سے پوچھا، "تم میں سے کس کو اپنے مال کے مقابلے میں وارثوں کا مال زیادہ پسند ہے ؟"

صحابہ کرام رضؓ نے جواب دیا، "ہم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کو اپنے مال سے زیادہ اپنے وارثوں کا مال عزیز ہو"

فرمایا، "تو اس کا مال تو وہی ہے جو اس نے آگے بھیجا، یعنی اللہ کی راہ میں خرچ کیا، اور جو اس نے پیچھے چھوڑا وہ تو اس کے وارثوں کا مال ہے"

اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی اس سے بہتر کیا تعریف ہو سکتی ہے۔

اطمینانِ قلب

دل کا اطمینان ایک ایسی چیز ہے جس کی تلاش میں انسان ہر وقت رہتا ہے اور اسے پالینے کے لیے زندگی بھر کوشش کرتا رہتا ہے۔ جس کو دل کا اطمینان مل جاتا ہے وہ پھر دنیا کی کسی چیز کا خواہش مند نہیں رہتا۔ اگر کسی کو دنیا کی تمام نعمتیں حاصل ہوں اور ہر قسم کی سہولتیں میسّر ہوں لیکن اس کا دل مطمئن نہ ہو تو وہ نہ کسی نعمت سے لُطف اُٹھا سکتا ہے اور نہ کسی سہولت سے آرام حاصل کر سکتا ہے۔ اگر دل کا اطمینان حاصل ہو جائے تو سمجھیے کہ ساری کوششیں کام یاب ہوئیں اور زندگی کا مقصد حاصل ہو گیا۔

اسلام نے ہمیں ایک ایسا نظام دیا ہے جس میں انسان کی روحانی اور مادّی دونوں ضرورتوں کا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ اسلام ایک طرف انسان کی زندگی کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے تو دوسری طرف اس کی روحانی ترقی کا سامان بھی مہیّا کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان محض اپنی نفسانی خواہشوں ہی کو پورا کرنے میں نہ لگا رہے، بلکہ وہ اس دنیا میں اس طرح زندگی گزارے کہ اللہ نے اس کو جو نعمتیں عطا کی ہیں ان سے پوری طرح لطف اٹھائے اور اس کے ساتھ ساتھ آخرت کا بھی خیال رکھے جہاں آخر کار اسے جانا ہے اور وہاں ہمیشہ رہنا ہے۔ اسی بنا پر اسلام انسان کی سرگرمیوں اور عمل کے لیے کچھ حدیں مقرر کرتا ہے۔ گویا ایک دائرہ

کھینچ دیتا ہے کہ اس کے اندر رہنا ہے باہر نہیں جانا ہے۔ زندگی کے ہر عمل میں چاہے وہ روزگار ہو یا تجارت، سیاست ہو یا باہمی تعلقات ان حدوں کی پابندی لازم قرار دی گئی ہے۔ ان پابندیوں کا مقصد یہ ہے کہ انسان وقتی خواہشوں کے پیچھے توازن اور اعتدال کا دامن نہ چھوڑے جس کے نتیجے میں انسان کا سکون اور اطمینان ختم ہو جاتا ہے اور وہ بے چین اور فکرمند ہو جاتا ہے۔

انسان کی زندگی میں دل کی جو اہمیت ہے اس سے ہر سمجھ دار آدمی واقف ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

"خوب سمجھ لو کہ جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے، جب یہ ٹھیک ہوتا ہے تو سارا جسم ٹھیک ہوتا ہے اور جب یہ بگڑ جاتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ اور یہ (گوشت کا ٹکڑا) دل ہے"

حضورؐ کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ جسم کی صحت اور بہتری اس بات میں ہے کہ دل ٹھیک رہے۔ اگر دل ٹھیک نہیں ہے تو پھر جسم بھی ٹھیک نہیں ہے۔ جسم کی صحت میں ذہن اور نفس کی صحت بھی شامل ہے۔ ذہن کے بگاڑ سے جسم متاثر ہوتا ہے اور اس کی صحت خراب ہوتی ہے۔ اسی طرح جسم کی تکلیف کا ذہن پر اثر ہوتا ہے اور ذہنی صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔ اگر دل مطمئن نہیں ہے تو جسم اور ذہن دونوں کو سکون نہیں ہوگا۔ انسان فطری طور چاہتا ہے کہ اس کے دل کو اطمینان حاصل ہو اور وہ اس کے لیے کوشش بھی کرتا ہے۔ اس اطمینان اور سکون کی ضرورت کی طرف قرآن نے بھی اشارہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "نوعِ انسانی کو دو حصوں میں اس لیے تقسیم کیا گیا ہے کہ وہ ایک دوسرے سے سکون اور راحت حاصل کریں"۔ یہی وجہ ہے کہ انسان دل کا اطمینان حاصل کرنے لیے ہر قسم کی جسمانی اور مادّی قربانیوں کو خوشی خوشی برداشت کر لیتا ہے۔

یہاں یہ بات سمجھ لینی ضروری ہے کہ دل کا سکون اور اطمینان کسی خاص چیز سے وابستہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک اضافی چیز ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک شخص جو بے روزگار ہے اپنی ساری توجہ نوکری تلاش کرنے پر صَرف کرتا ہے اور اس کو اتنا سکون نہیں ہوتا کہ

اپنے بچوں کے ساتھ کچھ وقت ہنس بول کر گزار دے۔ لیکن ایک دوسرا شخص جس کو روزگار کی فکر نہیں ہے وہ اس لیے بے چین رہتا ہے کہ اس کے ہاں اولاد نہیں ہے۔ اس کو فرصت حاصل ہے لیکن بچوں کی خوشی حاصل نہیں ہے۔ اس طرح یہ دونوں اللہ کے بندے سکون کی تلاش میں ہیں۔ ایک کے پاس دولت ہے تو اولاد نہیں ہے، دوسرے کے پاس اولاد ہے تو دولت نہیں ہے۔ ایک اس اطمینان کی تلاش میں ہے جو دولت سے حاصل ہوتا ہے اور دوسرا اس سکون کے لیے بے چین ہے جو اولاد سے ملتا ہے۔

ہر حالت میں اطمینانِ قلب کی صورت صرف یہی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی قدرت پر پورا پورا یقین رکھے اور اپنی خواہشوں کو اللہ کی مرضی سے وابستہ کرلے۔ جو اللہ کی مرضی ہو اسی میں وہ خوش رہے۔ اس سے یہ فائدہ ہے کہ اس کو ہر تکلیف راحت معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ ہر حال میں خوش رہتا ہے اور اس کا دل مطمئن رہتا ہے۔ دل کا سکون چھیننے والی سب سے بڑی چیز مایوسی ہے۔ مایوس انسان اطمینانِ قلب سے محروم رہتا ہے۔ ناامیدی بے اطمینانی پیدا کرتی ہے اور امید دل بڑھاتی ہے۔ اسی لیے مایوسی کو کفر قرار دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے:

"اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔"

الزمر: ۵۳

مایوسی کا ایک نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس سے مایوسی اور بڑھتی ہے۔ بے عمل انسان کچھ حاصل نہیں کرسکتا۔ اطمینان اور توکل کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ خود کچھ نہ کرو، اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرو کہ وہ سارے کام بنادے گا۔ توکل کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی سی کوشش کرلے، اس کے بعد نتیجے کے لیے بے چین ہونے کے بجائے اللہ پر بھروسا کرے اور اس سے اچھی امید رکھے۔ اگر انسان صرف اپنے اوپر بھروسا کرے گا تو وہ اپنی کامیابی پر مغرور ہو جائے گا اور ناکام ہوا تو مایوس اور بزدل ہو جائے گا۔ اس طرح اطمینانِ قلب کی دولت اس سے چھن جائے گی۔

دل کے سکون کے لیے اللہ اور آخرت پر ایمان کے ساتھ ساتھ محنت اور کوشش

بھی ضروری ہے۔ عمل سے خالی ایمان اور کوشش کے بغیر یقین انسان کو کبھی اطمینانِ قلب نہیں دے سکتا۔ اللہ پر یہ ایمان کہ سب کچھ اسی کے قبضے اور قدرت میں ہے، جتنا مضبوط ہوگا اتنا ہی عمل اچھا ہوگا اور اتنا ہی زیادہ دل کو سکون اور اطمینان حاصل ہوگا۔

اسلام انسان کی زندگی میں توازن چاہتا ہے۔ اسلام میں نیکی کا تصوّر یہ نہیں کہ انسان دنیا سے الگ تھلگ ہو جائے، صرف عبادت کرتا رہے۔ اسلام میں عبادت کا تصوّر کافی وسیع ہے۔ صرف نماز اور روزہ ہی عبادت نہیں، بلکہ انسان کا ہر وہ کام عبادت ہے جو اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کے مطابق ہو۔ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ اللہ کے نیک بندے دنیا کو چھوڑ کر اللہ کے ذکر میں لگ جائیں اور دنیا کا انتظام ان لوگوں کے لیے چھوڑ دیں جو اللہ کے نافرمان ہیں اور اللہ کے بندے دل کے اطمینان اور سکون سے محروم ہو جائیں۔ اللہ کی عبادت، نیک عمل ہے۔ حسنِ اخلاق ہے اور اللہ کے بندوں سے محبت اور ہمدردی ہی میں انسان کی بھلائی ہے۔

علم

اسلام میں علم کی وہی اہمیت ہے جو اندھیرے میں روشنی کی ہے۔ اسلام دنیا کا وہ واحد دین ہے جس نے دین کی بنیاد علم پر رکھی ہے اور لوگوں سے بار بار کہا ہے کہ وہ علم حاصل کریں اور کائنات پر غور و فکر کریں۔ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، "علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔" ایک اور حدیث شریف کا مطلب یہ ہے کہ علم حاصل کرنے کے لیے اگر دور دراز کا سفر بھی کرنا پڑے تو ضرور کرے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں سچے مسلمانوں کے بارے میں فرمایا ہے، "یہ وہ لوگ ہیں کہ ان کو جب ہم اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے۔ اچھی باتوں کا حکم دیں گے اور بُری باتوں سے روکیں گے۔" اس سے معلوم ہوا کہ نہ صرف دین کی تعلیم دینا مسلمانوں پر فرض ہے، بلکہ دین کے احکام کو نافذ کرنا بھی سب سے بہتر اُمّت ہونے کی حیثیت سے ان کا فریضہ ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ ذمے داری وہی لوگ پوری کر سکتے ہیں جو صاحبِ علم ہوں، اللہ کے احکام کو سمجھتے ہوں، رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتے ہوں اور دین کا اتنا علم رکھتے ہوں کہ اچھائی اور بُرائی میں تمیز کر سکیں۔

حضورؐ علم کے پھیلانے میں اتنی دل چسپی رکھتے تھے کہ جب بدر کی جنگ میں گرفتار ہونے والے بعض قیدی اپنی رہائی کے لیے رقم، جسے فدیہ کہتے ہیں، نہ دے سکے تو حضورؐ نے ان سے فرمایا، "تم دس مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دو۔ یہی تمھارا فدیہ ہے۔ پھر تم آزاد ہو گے۔"

مدینے میں مسلمانوں کو زیادہ تر یہودیوں سے واسطہ پڑتا تھا جن کی مذہبی زبان عبرانی تھی۔ یہ بعض اوقات مسلمانوں کی عبرانی سے ناواقفیت سے غلط فائدہ اُٹھاتے تھے۔ رسول اللہؐ نے اس بات کو محسوس کیا تو حضرت زید بن ثابتؓ کو حکم دیا کہ وہ عبرانی زبان سیکھ لیں۔ حضرت زیدؓ نے اللہ کے رسولؐ کی دعا کی بدولت پندرہ دن کی معمولی سی مُدت میں عبرانی زبان میں مہارت حاصل کرلی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن و حدیث کے علاوہ مسلمانوں کے لیے ایسے تمام علوم اور فنون سیکھنا لازمی ہے جو ان کے لیے مفید اور کار آمد ہوں۔

رسول اللہؐ کے زمانے میں عرب کے جن علاقوں میں اسلام پھیل گیا تھا ان میں یمن کا علاقہ سب سے بڑا اور ترقی یافتہ تھا۔ اس بنا پر حضورؐ نے اس علاقے کو پانچ حصّوں میں تقسیم کردیا اور ہر ایک کے لیے الگ الگ گورنر مقرر فرمائے۔ ان کے ذمّے ملکی انتظام اور مقدموں کے فیصلوں کے علاوہ سب سے بڑا کام اسلام کی تبلیغ اور سُنّت اور فرائض کی تعلیم تھا۔ چناں چہ جب حضورؐ حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کے ایک حصّے کا قاضی بنا کر بھیجنے لگے تو ان سے فرمایا، "تم اہلِ کتاب کے پاس جاتے ہو، پہلے ان کو توحید کا پیغام دینا۔" ان ذمّے داریوں کو ادا کرنے کے لیے ضروری تھا کہ حاکم علم رکھتا ہو اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں معاملے کو سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی صلاحیت بھی ہو۔ اسی لیے حضورؐ لوگوں کے علم اور سمجھ بوجھ کا امتحان بھی لیتے تھے۔ چناں چہ حضرت معاذؓ سے حضورؐ نے پوچھا کہ مقدمات کا فیصلہ کیسے کروگے؟ انھوں نے جواب دیا کہ قرآن مجید سے۔ آپؐ نے پھر پوچھا، "اگر اس میں فیصلہ تم کو نہ ملے تو کیا کروگے؟" حضرت معاذؓ نے جواب دیا کہ سنتِ رسولؐ سے ہدایت لوں گا۔ آپؐ نے فرمایا، "اور اگر یہ بات وہاں بھی نہ ملے تو کیا کروگے؟" تو جواب دیا کہ اس صورت میں اپنی رائے سے فیصلہ کروں گا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا، "اللہ کا شکر ہے جس نے اللہ کے رسولؐ کے ساتھی کو اس چیز کی توفیق دی جس کو خود اس کا رسولؐ پسند کرتا ہے۔"

چناں چہ سورۂ توبہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا، "سب کے سب مسلمان تو سفر کر کے (مدینے) نہیں آسکتے۔ اس لیے ہر قبیلے سے ایک گروہ کو آنا چاہیے کہ وہ دین کی سوجھ بوجھ اپنے اندر پیدا کریں اور واپس جا کر اپنی قوم کو بے علمی کے وبال سے ڈرائیں تاکہ لوگ بُری

باتوں سے بچیں۔" اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے علم کو خاص اہمیت عطا فرمائی ہے اور دین اسلام کی بنیاد علم پر ہے، ایسا علم جو قرآن اور حدیث کے علاوہ دیگر علوم پر بھی حاوی ہو۔ قرآنِ پاک، میں بار بار ایسی آیتیں آتی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ کائنات پر غور کریں اور یہ بھی فرمایا ہے کہ کائنات پر غور و فکر وہی لوگ کر سکتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔ حضورؐ نے ایک موقع پر فرمایا، "باپ کا اپنے بچے کو ادب سکھانا بہترین نیکی ہے۔" اسی طرح ایک اور موقع پر فرمایا کہ کوئی اپنے بچے کو اس سے بہتر عطیہ نہیں دے سکتا کہ وہ اس کو اچھی تعلیم دے۔ ظاہر ہے کہ اس سے ایسی تعلیم مُراد ہے جس سے انسان ایک اچھا مسلمان بن سکے، اس کے اخلاق درست ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں اس کائنات کے چُھپے ہوئے رازوں کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔

حضورؐ نے مسلمانوں کی تعلیم اور تربیت کے دو طریقے رکھے تھے۔ ایک طریقہ یہ تھا کہ مختلف قبیلوں کے لوگ مدینے میں آکر چند دن ٹھہرتے اور ضروری مسائل سیکھ کر واپس چلے جاتے اور اپنے قبیلے کو تعلیم دیتے۔ دوسرا طریقہ مستقل درس اور تعلیم کا تھا۔ اس کے لیے مسجدِ نبوی ہی میں ایک جگہ مخصوص تھی جہاں حضورؐ کے صحابہؓ علم حاصل کرتے۔ ایک مرتبہ حضورؐ اپنے حجرۂ مبارک سے باہر تشریف لائے تو دیکھا کہ لوگ درس و تعلیم میں مشغول ہیں تو آپؐ یہ کہہ کر ان کے ساتھ بیٹھ گئے کہ میں تو معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اس واقعے سے دین میں علم کی جو اہمیت ہے وہ واضح ہو جاتی ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس اُمّت کو سب سے پہلا سبق علم کا دیا گیا ہو اور جس کے رسولؐ پر پہلی وحی بھی اقرأ، یعنی پڑھو سے شروع ہوئی ہو وہ علم کے میدان میں سب سے آگے کیوں نہیں ہے؟ دراصل ہم یہ بات بھول گئے کہ زمین اور آسمان اور ان میں جو کچھ موجود ہے وہ سب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے مسخّر کر دیا ہے۔ مگر آج حال یہ ہے کہ دوسری قومیں کائنات کی تسخیر میں لگی ہیں۔ ہمیں اپنی زندگی کے کسی لمحے میں بھی یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے سچے نبیؐ نے ہمیں علم حاصل کرنے اور علم کو پھیلانے کی ہدایت فرمائی ہے۔ علم کی روشنی اور ایمان کی قوّت ہی سے مسلمان دنیا میں عدل اور انصاف قائم کر سکتے ہیں اور سر بلند اور سرفراز رہ سکتے ہیں۔

عمل کی اہمیت

عمل کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ عمل کے بغیر زندگی کا تصوّر ہی ممکن نہیں. زندگی نام ہی عمل کا ہے، بے عملی موت ہے۔ عمل ہی سے زندگی بنتی اور بگڑتی ہے۔ عمل سے چاہے تو انسان اپنی زندگی کو جنّت بنالے اور چاہے جہنّم۔ بے عملی اور نکھٹّو پن نہ صرف انسان کو سُست اور کاہل بناتا ہے، بلکہ بے یقین اور بزدل بھی بناتا ہے۔ اس کے برعکس عمل انسان کو چاق وچوبند رکھتا ہے، اس میں اعتماد پیدا کرتا ہے اور لوگ اس کی عزت کرتے ہیں۔ باعمل اور محنتی لوگوں کو اپنی ذات پر بھروسا اور اعتماد پیدا ہوتا ہے. اس اعتماد ہی سے وہ بڑے بڑے کام کر گزرتے ہیں اور ترقی کی منزلیں طے کرتے چلے جاتے ہیں۔ جس شخص کو اپنے اوپر اعتماد اور اپنی قوتوں پر بھروسا نہ ہو، وہ کوئی کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔ عمل سے محروم انسان کوئی کام خوبی اور سلیقے سے نہیں کرسکتا۔ اس میں حوصلہ نہیں رہتا۔ اس کے ارادے کمزور ہوتے ہیں اور اس کی ہمّت پست ہو جاتی ہے۔

عمل کے عادی انسان اپنے کام کے لیے دوسروں کے محتاج نہیں ہوتے۔ وہ اپنا کام خود کرتے ہیں اور اس میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اپنا کام خود کرنے والا کسی کا احسان مند نہیں ہوتا۔ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ آپؐ کو اس میں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اپنے پھٹے ہوئے کپڑے خود سی لیتے تھے۔ بکریوں کا دودھ خود دوہ لیتے تھے، آپؐ کے جوتے ٹوٹ جاتے

تو اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیتے۔ آپؐ اپنے کام کے لیے دوسروں کو تکلیف دینے کے بجائے یہ پسند کرتے کہ خود کرلیں۔ آپؐ کے خادم حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہؐ کی اتنی خدمت نہیں کی جتنے کہ میرے کام آپؐ نے کر دیے۔ حضورؐ بازار سے سودا سلف خود لے آتے، جھاڑو خود دے لیتے۔ گھر کے دوسرے کاموں میں گھر والوں کا ساتھ دیتے اور ان کا ہاتھ بٹاتے۔ ایک بار آپؐ گھر کی مرمت کر رہے تھے کہ آپؐ کے دو صحابیؓ آئے۔ حضورؐ کو کام کرتا دیکھ کر خود بھی مرمّت کے کام میں شریک ہو گئے۔ کام ختم ہوا تو حضورؐ نے ان دونوں کے لیے دعا فرمائی۔

ایک سفر کے دوران صحابہؓ کو کھانا تیار کرنا پڑا۔ صحابہؓ نے آپس میں ایک ایک کام بانٹ لیا۔ جنگل سے لکڑیاں چُن کر لانے کا کام حضورؐ نے اپنے ذمّے لیا۔ صحابہؓ نے عرض کیا،

"یارسول اللہؐ، یہ کام بھی ہم آپؐ کے غلام کرلیں گے۔"

دونوں عالم کے سردارؐ نے جواب دیا، "مجھے یہ پسند نہیں کہ میں خود کو تم لوگوں سے الگ رکھوں یا اپنے آپ کو بڑا سمجھوں۔ اللہ اس بندے کو پسند نہیں کرتا جو اپنے ساتھیوں سے اپنے آپ کو بڑا شمار کرتا ہو۔"

ہمارے پیارے نبیؐ لوگوں کے معمولی سے معمولی کام بھی کر دیا کرتے تھے۔ مدینے کی لڑکیاں آتیں اور عرض کرتیں:

"یارسول اللہؐ! ہمارا یہ کام کر دیجیے۔"

آپؐ فوراً اُٹھ کر ان کا کام کر دیتے۔ ایک بار حضورؐ نے دیکھا کہ ایک غلام بیماری کی حالت میں اپنے آقا کے ڈر سے آٹا پیس رہا ہے اور روتا جا رہا ہے۔ آپؐ اس کو ہٹا کر خود آٹا پیسنے بیٹھ گئے۔ آٹا پس گیا تو فرمایا:

"آیندہ بھی ضرورت پڑے تو مجھے بلا لینا۔"

اسی طرح ایک بوڑھا غلام اپنے آقا کے باغ میں پانی دے رہا تھا۔ آپؐ نے دیکھا کہ کنویں سے پانی نکالنے میں اس بوڑھے غلام کے ہاتھ کانپ جاتے ہیں۔ آپؐ نے اس سے ڈول لے کر خود پانی نکالنا شروع کر دیا۔ جب کام پورا ہو گیا تو حضورؐ نے اس غلام سے فرمایا:

"دیکھو، جب کبھی تمھیں مدد کی ضرورت ہو مجھے خبر کر دینا۔"

یہ تو چند مثالیں ہیں جو میں نے یہ بتانے کے لیے پیش کی ہیں کہ عمل اور محنت کی کیا اہمیت ہے اور ہمارے پیارے نبیؐ نے اس کا کیا سبق ہمیں دیا ہے، ورنہ حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ کی ساری زندگی عزم اور عمل، محنت اور جدوجہد، ہمت اور ثابت قدمی میں گزری ہے۔ آپؐ نے جب اسلام کی طرف لوگوں کو بلایا تو ہر طرف سے مخالفت شروع ہوگئی۔ آپؐ کو بڑی بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا، طرح طرح کی سازشیں آپؐ کے خلاف ہوئیں، مگر آپؐ نے کسی چیز کی پروا نہ کی اور ثابت قدمی اور حوصلے سے دین پھیلانے کے کام میں لگے رہے، یہاں تک کہ حق کا بول بالا ہوا، مخالفتیں ختم ہوگئیں، مصیبتوں کے بادل چھٹ گئے۔

حضورؐ نے ہمیں اس طرح یہ تعلیم بھی دی کہ مقصد کی لگن اور اس کے لیے مسلسل کوشش انسان کو دیر یا سویر کامیاب کر دیتی ہے اور سب مشکلیں دور ہو جاتی ہیں۔

دنیا "دارالعمل" ہے یعنی کام کرنے کے لیے ہے۔ جو جتنا اور جیسا کام کرے گا اتنا اور ویسا ہی بدلا پائے گا۔ اللہ نے انسان کو جو زندگی دی ہے وہ عمل ہی کے لیے دی ہے۔ اس زندگی میں انسان کو یہ سمجھ کر کام کرنا چاہیے کہ جو کچھ میں کروں گا اسی کے مطابق مجھے بعد کی زندگی میں اچھا یا بُرا نتیجہ ملے گا۔ مجھے جو کچھ ملے گا وہ میرے اعمال کا بدلا ہوگا۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"جو شخص ذرّہ برابر نیک عمل کرے گا اس کا نتیجہ دیکھ لے گا اور جو شخص ذرّہ برابر بھی بُرا عمل کرے گا وہ اس کا نتیجہ بھی دیکھ لے گا۔"

(الزلزال: ۷-۸)

یعنی جیسا بوئے گا ویسا کاٹے گا۔ کوئی شخص بُرے کام کر کے یہ نہ سمجھے کہ وہ بچ جائے گا۔ جس طرح پانی میں کنکر پھینکنے سے لہریں پیدا ہوتی ہیں اسی طرح انسان کے عمل کے اچھے یا بُرے نتائج ضرور پیدا ہوتے ہیں۔

خدمتِ خلق

شیخ سعدیؒ کا ایک مشہور شعر ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جو دوسروں کی خدمت کرتا ہے وہ عزّت پاتا ہے اور جو صرف اپنی ہی فکر میں لگا رہتا ہے اس کو کوئی عزّت اور مرتبہ نہیں ملتا۔

مخلوق کی خدمت کرنا اچھے اخلاق کی نشانی ہے۔ جو انسان مخلوق کی خدمت کرتا ہے اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس کا مرتبہ اور درجہ بہت بلند ہے۔ جو شخص اللہ کے بندوں سے پیار کرتا ہے۔ اور ان کی کسی لالچ اور غرض کے بغیر خدمت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو عزت عطا کرتے ہیں۔ قدرت کا یہ اصول ہے کہ مخلوق کی خدمت کرنے والے کو اونچا مرتبہ ملتا ہے اور دین و دنیا کی ہر دولت اسے حاصل ہوتی ہے۔

یہ بات ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل ہے کہ بلند مرتبے پر وہی لوگ پہنچ سکتے ہیں جو خود کو دیکھنا چھوڑ دیں۔ اپنی ذات کو قربان کر دیں، اپنے عیش اور آرام اور اپنی خواہشات کو چھوڑ کر دوسرے انسانوں کے فایدے اور ان کے آرام کے لیے کام کریں۔ اپنے آپ کو بھول کر دوسرے انسانوں کی خدمت میں لگ جائیں۔

غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ خدمتِ خلق سے بڑی اور کوئی خوبی نہیں ہے جس سے معاشرے میں محبت کی فضا قائم ہو اور لوگ ایک دوسرے کو اپنا دوست اور ہمدرد سمجھیں۔ محتاجوں کی ضرورتیں پوری کرنا، بھوکے کو کھانا کھلانا، ننگے کو کپڑے پہنانا، بیمار کے لیے علاج کا انتظام کرنا، یتیموں کے سر پر ہاتھ رکھنا، بیواؤں کی دیکھ بھال کرنا، یہ سب بنیادی

خدمتیں ہیں جن سے نہ صرف خدمت کرنے والے کو اطمینان نصیب ہوتا ہے اور ضرورت مند کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں بلکہ ان خدمتوں کے ذریعہ سے معاشرے میں بڑا چین، خوش حالی اور اطمینان پیدا ہوتا ہے۔ کسی کو کسی سے شکایت نہیں رہتی۔ سب لوگ ایک دوسرے کو اپنا بھائی، مددگار اور ہمدرد سمجھنے لگتے ہیں اور آپس میں اعتماد اور محبت قائم ہوتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک سیرت ہر مسلمان کے لیے بہترین نمونہ ہے۔ یہی وہ نمونہ ہے جس پر عمل کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ حضورؐ کی ساری زندگی خدمتِ خلق ہی میں گزری ہے۔ ایک مرتبہ ایک عورت مکہ مکرمہ کی ایک گلی میں سے گزر رہی تھی، اس کے سر پر اتنا بھاری بوجھ تھا کہ وہ مشکل سے قدم اٹھا سکتی تھی۔ بعض اس کا مذاق اڑانے لگے۔ حضورؐ کہیں قریب ہی تھے۔ آپؐ اس عورت کی مشکل دیکھ کر فوراً آگے بڑھے اور اس کا بوجھ اٹھا کر اس کی منزل تک پہنچا دیا۔ ایک اور واقعہ ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن ایک گلی میں سے گزر رہے تھے کہ ایک اندھی عورت ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔ بعض لوگ اسے دیکھ کر ہنسنے لگے لیکن ہمارے پیارے نبیؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ آپؐ نے اس عورت کو اٹھایا اور اسے اس کے گھر تک پہنچا کر آئے۔

رسول اللہؐ کو اللہ تعالیٰ نے خدمتِ خلق کا بے پناہ جذبہ عطا فرمایا تھا۔ آپؐ ہر وقت اللہ کے بندوں کی خدمت کے لیے تیار رہتے تھے۔ اپنا ہو یا غیر، مسلمان ہو یا غیر مسلم، آقا ہو یا غلام، آپ ہر ایک کے کام آتے تھے اور ان کا چھوٹے سے چھوٹا کام بھی کر دیتے تھے۔ مکے سے ہجرت کر کے آپؐ جب مدینے تشریف لائے تو آپؐ کی زندگی بہت مصروف ہو گئی۔ کافروں کا مقابلہ کرنا، اندرونی دشمنوں کی سازشوں کو روکنا، مسلمانوں کی تربیت کرنا، انھیں تعلیم دینا اور ایک مثالی معاشرہ قائم کرنا ایسے اہم کام تھے، جن میں حضورؐ ہر وقت پوری توجہ سے مصروف رہتے تھے لیکن اس کے باوجود جب بھی معمولی سے معمولی خدمت کا کوئی موقع آتا تو آپ اس کو کرنے میں لگ جاتے۔

اللہ کے رسول اور ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا میں بسنے والے انسانوں کو ایک نئی زندگی سے واقف کرایا۔ انسان اندھیرے میں تھا، آپؐ نے اُسے

روشنی دکھائی، اس کی رہبری کی اور ایک ایسا معاشرہ قائم کردیا جس نے ساری دنیا میں انقلاب برپا کردیا۔ مسلمان، عرب کے صحرا سے قرآن کی روشنی اور رسول اللہؐ کے عمل کا نمونہ لے کر اٹھے اور دنیا کے کونے کونے میں ایمان کا نور پھیلا دیا۔

قرآنِ پاک نے ان کو ہدایت کی تھی:

"لوگوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کرو جیسا اللہ نے تمھارے ساتھ کیا ہے۔"

مسلمانوں نے ساری دنیا میں اچھے برتاؤ کا ایسا مظاہرہ کیا کہ لوگ حیرت زدہ رہ گئے اور اسلام کے شیدائی بن گئے۔ مسلمانوں کے پاس قرآنِ حکیم ہے، اللہ کے رسولؐ کے عمل کا نمونہ ہے۔ یہ اتنی بڑی دولت ہے، عظمت ہے کہ اس کے بعد تو انھیں کسی اور چیز کی ضرورت ہی نہیں۔ ان کو ضرورت ہے تو صرف عمل کی۔ خدمتِ خلق بھی ایک عمل ہے، ہمیں چاہیے کہ ایسے انسان بنیں جن کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

"ترجیح دیتے ہیں وہ دوسروں کو اپنے آپ پر خواہ خود ضرورت مند ہی کیوں نہ ہوں۔"

ہمارا ایمان اس حدیث شریف پر ہونا چاہیے کہ "اللہ اس بندے کی مدد کرتا ہے جو دوسرے بندوں کی مدد کرتا ہے۔"

خدمتِ خلق کی وجہ ہی سے ہمارے بزرگوں کو دنیا میں عزت حاصل تھی اور لوگوں کے دلوں میں ان کا احترام تھا۔ ہماری کوشش یہی ہونا چاہیے کہ ہم اپنا یہ کھویا ہوا مقام حاصل کرلیں۔ اس کوشش میں کامیابی کی ایک ہی صورت ہے وہ یہ کہ ہم اللہ کے رسولؐ کی سچے دل سے پیروی کرتے ہوئے دکھی انسانیت کی خدمت میں لگ جائیں۔

بندوں کے حقوق

انسانوں کی بھلائی، ان کی خوش حالی اور ان کے امن اور سکون کے لیے ضروری ہے کہ وہ مل جل کر رہیں، ایک دوسرے سے محبت کریں، ایک دوسرے کی عزت کریں۔ اسی مل جل کر رہنے کی ضرورت سے قوم اور قبیلے وجود میں آئے اور معاشرہ قائم ہوا۔ معاشرے کی بنیاد اس بات پر ٹھیری کہ لوگ ایک دوسرے کا حق ادا کریں اور اپنے فرائض کو پہچانیں۔ اس کے بغیر نہ کوئی معاشرہ وجود میں آسکتا ہے اور نہ یہ ترقی کر سکتا ہے۔

قرآنِ پاک میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ کائنات کی تمام چیزیں اللہ نے ہمارے ہی فائدے کے لیے پیدا کی ہیں۔ قدرتی طور پر یہ زمین اور اس زمین میں جو کچھ موجود ہے وہ سب اسی لیے ہے کہ اللہ کے بندے اس سے فائدہ اُٹھائیں۔ اسی لیے زمین پر بسنے والے تمام انسانوں کا فرض ہے کہ اللہ کی دی ہوئی ان نعمتوں سے خود بھی فائدہ اٹھائیں اور دوسرے انسانوں کو بھی فائدہ پہنچائیں۔ بندوں کا حق اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ ان کے فائدے کا، ان کی ضرورتوں کا اور ان کے حصّے کا خیال رکھا جائے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے کسی کو دولت دی تو اس کا تقاضا ہے کہ جن کو دولت نہیں ملی ہے ان کو اس میں سے دیا جائے، اس لیے کہ یہ ان کا حق ہے اور اس کا شمار بندوں کے حقوق میں ہونا ہے۔

اسی طرح جب اللہ نے کسی کو تھوڑی یا زیادہ زمین دی اور اس نے اس میں

کچھ بویا، پھر اللہ کی رحمت سے ہری بھری کھیتی تیار ہوئی تو اس کا فرض ہے کہ پوری پیداوار خود نہ رکھ لے، بلکہ اس کا حق ادا کرے اور اس میں سے ان کو بھی کچھ دے جن کو یہ نعمت نہیں ملی ہے۔

بندوں کے ایک دوسرے پر جو حق ہیں وہ تو اسلام نے صاف صاف بتا ہی دیے ہیں، ان کے علاوہ بندوں پر جانوروں، درختوں اور دوسری چیزوں کے جو حق ہیں وہ بھی بتا دیے ہیں۔ ایک بار اللہ کے رسولؐ نے فرمایا کہ ایک شخص صرف اس لیے بخشا گیا کہ اس نے ایک پیاسے کتے کو پانی پلا کر اس کی جان بچائی تھی۔ اسی طرح آپؐ نے ایک بار ایک عورت کے بارے میں جو اپنی بلی کو بھوکا رکھتی تھی فرمایا کہ اس کی بے رحمی کی وجہ سے اس کو عذاب دیا جائے گا۔ مطلب یہ سمجھ لیں کہ انسانوں کے حقوق ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ کی پیدا کی ہوئی دوسری چیزوں کے حقوق بھی ادا کرنے چاہییں۔

حقوق کی ادائگی کے معاملے میں اسلام پہلا اور آخری دین ہے جس نے یہ بھی بتا دیا ہے کہ کس کا حق پہلے ادا کرنا ہے اور کس کا بعد میں۔ اسلام اسے پسند نہیں کرتا کہ والدین اور رشتے دار محروم رہیں اور دوسروں کو فائدہ پہنچے۔ اسلام چاہتا ہے کہ سب سے پہلے بندہ اپنے ماں باپ اور بہن بھائی کے حقوق ادا کرے پھر اس کے بعد قریب کے اور پھر دوسرے لوگوں کے۔ اسلام نے اس مقصد کے لیے سب کے درجے مقرر کر دیے ہیں۔ اگر کوئی شخص ماں باپ کا حق ادا نہ کرے، یتیموں، مسکینوں اور پڑوسیوں کا خیال نہ کرے، مسافروں کی مدد نہ کرے، غلاموں کو آزادی دلانے اور مصیبت زدہ مسلمانوں کو پریشانی سے نکالنے کی کوشش نہ کرے تو چاہے وہ دوسروں کے ساتھ کتنا ہی اچھا سلوک کیوں نہ کرے، ان کو کتنا ہی فائدہ کیوں نہ پہنچائے اسلام کے نزدیک حق ادا نہیں ہوگا۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے پہاڑ اور بنجر زمین پر تو پانی برسے مگر پیداوار والی زمین خشک رہے۔

اسلام نے بندوں کے حق کو جو اہمیت دی ہے وہ اس سے پہلے کسی دین یا معاشرے میں نہیں تھی۔ اسلام میں ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنا، بیواؤں کی دیکھ بھال اور یتیموں کی پرورش کرنا، معذوروں کی مدد کرنا اور ان پڑھ لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھانا

بہترین عبادت ہے۔ اسلام میں تاکید کی گئی ہے کہ پڑوسی بھوکا نہ رہے۔ اگر ہمارا پڑوسی بھوکا رہا اور ہم نے پیٹ بھر لیا تو یہ کھانا ناجائز ہو گیا۔

جو لوگ بندوں کے حق ادا کرتے ہیں اور دوسروں کی خاطر اپنے آرام اور آسائش کو چھوڑ دیتے ہیں، اسلام کی نظر میں ان کا بڑا مرتبہ ہے۔ قرآن پاک میں حضور اکرمؐ سے فرمایا گیا ہے، "لوگ یہ پوچھتے ہیں کہ وہ اپنی آمدنی کا کتنا حصہ دوسروں پر خرچ کریں تو ان سے کہہ دیجیے کہ جو کچھ بچ رہے سب دوسروں کو دے دیں۔" اس کا مطلب یہ نہیں کہ انسان اپنی دولت لٹا کر خود بھکاری اور محتاج بن جائے، بلکہ مقصد یہ ہے کہ اپنی ضرورتیں پوری کرنے کے بعد جو آمدنی بچ جائے وہ دوسروں پر خرچ کی جا سکتی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اسلام یہ نہیں کہتا کہ تم احسان کر رہے ہو بلکہ وہ اصرار کرتا ہے کہ بندوں کا حق ادا کرنا بندوں پر فرض ہے، اللہ کی رضا کا ذریعہ ہے اور اس کے رسولؐ کی اطاعت اور فرماں برداری ہے۔

اچھّے اخلاق

یہ ایک حقیقت ہے کہ دین اس وقت تک کامل نہیں ہو سکتا جب تک اخلاق بلند نہ ہوں۔ ایک حدیث شریف میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

"میں تو اسی لیے بھیجا گیا ہوں کہ اچھے اخلاق کی تکمیل کروں۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ جب رسول اللہؐ اللہ کی کتاب قرآنِ حکیم لے کر دنیا میں اسلام پھیلانے کے لیے اُٹھے تو آپؐ نے سب سے پہلے لوگوں کے اخلاق درست کیے تا کہ وہ دوسرے انسانوں کے لیے محبت اور ہمدردی کا نمونہ بن جائیں اور یہ دنیا انسان کے لیے امن اور سلامتی کی جگہ بن جائے۔

حضورؐ کی زندگی کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے اخلاق سُدھارنے کا کام آپؐ نے مکّے ہی میں شروع کر دیا تھا۔ نبوت کا شروع زمانہ تھا کہ حضرت ابوذرؓ نے اپنے بھائی کو مکّے بھیجا کہ وہ وہاں جا کر دیکھیں کہ نئے پیغمبر کیسے ہیں اور کیا تعلیم دیتے ہیں۔ انھوں نے واپس آکر اپنے بھائی کو بتایا:

"میں نے محمدؐ کو دیکھا، آپؐ لوگوں کو اچھّے اخلاق سکھاتے ہیں۔" اس سے یہ معلوم ہوا کہ آپؐ دین کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ اچھے اخلاق بھی سکھاتے تھے۔

اسی زمانے میں جب مکّے کے لوگوں کے ظلم سے تنگ آکر کچھ مسلمان حضورؐ سے اجازت لے کر حبشہ چلے گئے تو یہ بات مشرکینِ مکّہ کو بہت ناگوار گزری اور انھوں نے حبشہ کے بادشاہ کے پاس ایک وفد بھیجا، جس نے بادشاہ کو تحفے بھی پیش کیے اور

مہاجرین کے خلاف طرح طرح کی باتیں بھی کیں۔ مقصد یہ تھا کہ بادشاہ، جو عیسائی تھا، مسلمانوں کے خلاف ہو جائے اور ان کو اپنے ملک سے نکال دے۔ بادشاہ نے اصل حقیقت معلوم کرنے کے لیے مسلمانوں کو دربار میں بلا بھیجا۔ مسلمانوں کی طرف سے حضرت جعفر طیارؓ نے بادشاہ کو بتایا:

"اے بادشاہ! ہم ایک ظالم قوم تھے، بُتوں کو پوجتے تھے، مُردار کھاتے تھے، بُرے کام کرتے تھے، ہمسایوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، طاقت ور کم زوروں کو کھا جاتے تھے۔ اس حالت میں ایک شخص ہم میں پیدا ہوا۔ اس نے ہم کو سکھایا کہ پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، ایک دوسرے کا خون نہ بہائیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کو تکلیف نہ پہنچائیں اور نیک لوگوں پر جھوٹے الزام نہ لگائیں۔"

یہ تمام باتیں اچھے اخلاق کی نشانیاں تھیں اس لیے شاہِ حبشہ پر ان کا بہت اثر ہوا۔

حضرت جعفر طیارؓ مسلمان ہو چکے تھے، اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا ہوگا، عقیدت اور محبت سے کہا ہوگا، لیکن روم کے بادشاہ کے دربار میں بالکل اسی طرح کا واقعہ ابوسفیان کے ساتھ پیش آیا جو اس وقت مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ جب روم کے بادشاہ نے ان سے پوچھا کہ پیغمبر اسلامؐ کس چیز کی طرف بلاتے ہیں؟ تو ابوسفیان نے کہا "حضورؐ یہ کہتے ہیں کہ اللہ ایک ہے اور اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ ساتھ وہ لوگوں کو یہ بھی سکھاتے ہیں کہ بُرے کاموں سے دور رہو، سچ بولو اور رشتے داروں کا حق ادا کرو۔"

اس ساری کائنات کو اللہ نے بنایا ہے۔ اسی نے انسان کو بھی پیدا کیا ہے، اس لیے وہ چاہتا ہے کہ دنیا میں انسان مل جل کر رہیں، فساد برپا نہ کریں، ایک اللہ کی عبادت کریں اور اس طرح رہیں، جیسے ایک گھر کے لوگ رہتے ہیں۔

اچھے اخلاق کا مطلب یہ بھی ہے کہ انسان دوسروں کی غلطیوں کو معاف کر دے، اپنے نفس پر قابو رکھے اور اس میں تحمل اور برداشت ہو۔ یہ آسان نہیں۔

اور جب لوگوں کو اس کی تعلیم دی جاتی ہے تو اس پر عمل کرنا انھیں دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اسلام نے اس مشکل کام کو بھی اتنے اچھے انداز میں بتایا ہے کہ فوراً دل پر اثر کرتا ہے۔ مثلاً سورۂ انعام میں فرمایا گیا:

"جن کو یہ مشرک اللہ کے سوا پکارتے ہیں، ان کو بُرا نہ کہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ اللہ تعالیٰ کو بے ادبی سے بغیر جانے بُرا کہہ بیٹھیں۔"

سورۂ اعراف میں فرمایا:

"معاف کرنے کی عادت ڈالو، نیک کام کا حکم دو اور جاہلوں سے دور رہو۔"

اسی سورہ میں نیک لوگوں کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ غصّے کو دبانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں۔

مسلمانوں کے آپس میں معاملات میں تو اچھے اخلاق پر زور دیا ہی گیا ہے اور انھیں ایک دوسرے کا بھائی کہہ کر اسے ایک نعمت بتایا ہے، لیکن غیر مسلموں کے ساتھ بھی نرمی کا سلوک کرنے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

حضرت معاذ بن جبل رضؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا:

جہاں بھی رہو اللہ سے ڈرتے رہو۔ کوئی گناہ کر بیٹھو تو فوراً کوئی نیک کام کرو کیونکہ نیکی گناہ کو مٹا دیتی ہے اور تمام انسانوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔"

اللہ تعالیٰ کے رسولؐ نے ایک اور صحابی سے فرمایا کہ تم میں مجھ کو سب سے زیادہ عزیز اور قیامت میں مجھ سے سب سے زیادہ قریب وہ لوگ ہوں گے جن کے اخلاق اچھے ہیں۔ اور تم میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ اور قیامت میں مجھ سے سب سے زیادہ دُور وہ لوگ ہوں گے جو بناوٹ کے ساتھ باتیں کرتے ہیں اور اپنی چکنی چپڑی باتوں سے دوسروں پر حاوی ہونا چاہتے ہیں۔

ایک بزرگ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے اچھے اخلاق کے معنی یہ بتائے ہیں کہ لوگوں سے اچھی طرح ملا جائے، ان پر اپنا مال خرچ کیا جائے اور ہمدرد بن کر ان کا دُکھ درد دور کیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اچھے اخلاق کے بغیر دین مکمل نہیں ہو سکتا۔ یہ دین کا نصف حصہ ہے اور جیسی دین میں عبادت کی اہمیت ہے ویسی ہی اخلاق اور معاملات کی ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے:

"تم میں اچھا مسلمان وہی ہے جس کے اخلاق اچھے ہیں۔"

اس سے بڑھ کر اچھے اخلاق کی اور کیا اہمیت ہو سکتی ہے کہ اللہ کے رسولؐ کے نزدیک اچھے اخلاق والا مسلمان ہی سب سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

سچّائی

دنیا میں کوئی اچھا کام ایسا نہیں ہوا ہے جو سچّائی سے خالی ہو۔ انسانی بھلائی کے ہر کام کی بنیاد سچائی پر ہے۔ ہمارے دینِ اسلام کی بنیاد بھی سچّائی پر ہے۔

سرکارِ دو عالم نے جب لوگوں کو دینِ اسلام کی طرف دعوت دی تو پہلے آپ نے اُن سے یہ سوال کیا، "لوگو! اگر میں تم سے کوئی بات کہوں تو کیا تم اس کو سچ مانوگے؟" لوگوں نے بغیر کسی تامّل کے جواب دیا، "بے شک ہم نے آپ کو ہمیشہ سچ بولتے سنا ہے۔ آپ جو بھی کہیں گے ہم اس کو سچ مانیں گے۔" حضور کے سوال کا یہ جواب ان لوگوں کی طرف سے تھا جو وحی پر یقین نہیں رکھتے تھے۔

اللہ کے رسول اور ہمارے رہنما صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار کا سب سے اہم پہلو یہی ہے کہ وہ سچے تھے، امین تھے اور ہمیشہ سچ ہی آپ کی زبان سے ادا ہوا۔ کردار کی اس بلندی نے آں حضرت کو اس بلند مرتبے تک پہنچایا کہ انھوں نے اللہ کے پیغام کو انسانوں کے دلوں میں اُتار دیا اور دین اسلام کی روشنی دنیا کے کونے کونے تک پھیلا دی۔ سچائی کی یہ روشنی آج بھی ہماری رہنما ہے اور قیامت تک انسان اسی روشنی میں آگے بڑھتا رہے گا اور یہ حقیقت اور سچّائی ہمیشہ ثابت ہو کر رہے گی کہ اللہ کے نزدیک اگر کوئی دین ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔

سچائی کا تعلق انسان کے دل اور اس کی زبان سے ہے۔ دل اور زبان جب ایک ہوتے ہیں تو سچائی جنم لیتی ہے۔ اگر دل اور زبان ایک نہ ہوں تو سچائی پیدا نہیں

ہو سکتی۔

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ نے ایک واقعہ درج کیا ہے کہ ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

"یا رسول اللہ! مجھ میں چار بُری عادتیں ہیں،

ایک یہ کہ میں بدکار ہوں،

دوسری یہ کہ میں چوری کرتا ہوں،

تیسری یہ کہ میں شراب پیتا ہوں،

چوتھی یہ کہ میں جھوٹ بولتا ہوں،

یا رسول اللہ! اِن چار بُری عادتوں میں سے جس ایک کو فرمایئے آپؐ کی خاطر چھوڑ دوں۔"

ارشاد ہوا: "جھوٹ نہ بولا کرو۔"

اب رات ہوئی تو شراب پینے کو اس کا جی چاہا اور پھر بدکاری پر آمادہ ہوا تو اس کو خیال گزرا کہ صبح کو جب حضورؐ پوچھیں گے کہ رات تم نے شراب پی اور بدکاری کی تو میں کیا جواب دوں گا۔ اگر ہاں کہوں گا تو شراب پینے اور بدکاری کی سزا دی جائے گی۔ اگر نہیں کہا تو وعدے کے خلاف ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ ان حرکتوں سے باز رہا۔ جب رات زیادہ گزر گئی اور خوب اندھیرا چھا گیا تو چوری کے لیے گھر سے نکلنا چاہا لیکن پھر اس خیال نے دامن تھام لیا کہ کل پوچھ گچھ ہوئی تو کیا جواب دوں گا۔ ہاں کروں گا تو ہاتھ کاٹا جائے گا اور نہیں کہوں گا تو وعدہ خلافی ہوگی۔ اس خیال کے آتے ہی چوری سے بھی باز رہا۔

صبح ہوئی تو وہ شخص رسول اللہؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا:

"یا رسول اللہ! جھوٹ نہ بولنے سے میری چاروں بُری عادتیں چھوٹ گئیں۔"

اس میں کوئی شک نہیں کہ سچ بولنا انسان کو بُرائیوں سے بچاتا ہے۔ جو انسان سچا ہو گا وہ بُرائی سے پاک رہنے کی کوشش کرے گا۔ سچا انسان ایمان دار ہو گا۔ وہ وعدہ خلاف نہیں ہو سکتا۔ سچائی انسان کو بہادر بناتی ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے:

" سچ میں نجات ہے اور جھوٹ میں ہلاکت۔"

اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کی مغفرت کا وعدہ کیا ہے ان میں ایمان اور اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری کے بعد پہلا درجہ سچ بولنے والوں اور سیدھے راستے پر چلنے والوں کا ہے۔ اسلام نے سچائی کی اہمیت کو بار بار جتایا ہے اور سچائی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ ہدایت کی ہے کہ سچوں کا ساتھ دو۔ قرآن پاک میں ہے:

" اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔"

سچائی کے معنی عام طور سے صرف سچ بولنے کے لیے جاتے ہیں لیکن اسلام کی نگاہ میں سچائی کے وسیع معنیٰ ہیں۔ سچائی صرف زبان کی نہیں بلکہ عمل کی بھی ہے۔ حضرت امام غزالیؒ نے چھے سچائیاں بیان کی ہیں:

بات میں سچائی، نیت میں سچائی، ارادے میں سچائی، ارادے کو پورا کرنے میں سچائی، عمل میں سچائی اور دین داری میں سچائی۔

زبان کی سچائی یہ ہے کہ زبان سے جو لفظ نکلے وہ سچا ہو۔ دل کی سچائی کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں خلوص ہو، عمل کی سچائی یہ ہے کہ انسان کا ظاہر اور باطن ایک ہو، اس کا ہر کام اس کے ضمیر کے مطابق ہو۔ ایسے تمام لوگ جن کی زبان سچی ہے، دل سچا ہے اور عمل سچا ہے ان کا ایمان بھی مضبوط ہوتا ہے اور ان کو سیدھے راستے سے کوئی چیز نہیں ہٹا سکتی۔

٧٩٠٥

حسد

اللہ تعالیٰ جب اپنے کسی بندے کو دولت، علم یا کوئی خوبی عطا کرتا ہے تو بعض لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی یہ نعمتیں اس سے چھن جائیں اور وہ ذلیل وخوار ہو جائے۔ حسد اسی جذبے اور خواہش کا نام ہے۔ اسلام کے نزدیک یہ بہت بڑی اخلاقی بُرائی ہے جس سے بچنے کی قرآنِ پاک میں بار بار ہدایت آئی ہے۔

حسد ایک ایسا بُرا جذبہ ہے جس کے اثرات دُور دُور تک جاتے ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو معاشرے میں زیادہ تر بُرائیاں اور جرائم اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ انسان کی عقل و سمجھ بے کار کر دیتا ہے اور اس کے دل سے سکون چلا جاتا ہے۔ حاسد یعنی حسد کرنے والا یہ چاہتا ہے کہ دوسروں کو جو مال و دولت ملا ہے وہ ان سے چھن جائے اور جو مرتبہ ان کو حاصل ہے وہ اس سے محروم ہو جائیں۔ وہ ہر وقت اسی میں جلتا اور کڑھتا رہتا ہے۔

حسد کی سب سے بڑی وجہ نفرت اور عداوت ہے۔ انسان کو جب کسی سے نفرت یا دشمنی ہوتی ہے تو وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کی خوبیاں اس سے چھین لی جائیں اور وہ رنج اور مصیبت میں مبتلا ہو جائے۔ اس کو خود کچھ ملے یا نہ ملے اس کی خوشی کے لیے یہی کافی ہے کہ اس کے دشمن کے پاس وہ چیز نہ رہے۔

حسد کا ایک اور سبب فخر اور غرور ہے۔ اگر برابر والوں میں کوئی کسی بڑے مرتبے یا عہدے پر پہنچ جاتا ہے تو ایک تنگ دل اور بد اخلاق آدمی کو اس سے تکلیف ہوتی ہے،

اس لیے کہ اس سے اس کی اپنی بڑائی ختم ہو جاتی ہے اور اسے فخر اور غرور کا موقع نہیں رہتا۔

حسد کی ایک اور وجہ یہ خواہش ہے کہ ہم اونچے رہیں اور دوسرا نیچے۔ بہت سے لوگ جن کا اخلاق کم زور ہوتا ہے ایک ہی مقصد ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے سے حسد کرنے لگتے ہیں، مثلاً ایک باپ کے کئی بیٹے ہوں اور باپ کی توجہ ان میں سے کسی ایک کی طرف زیادہ ہو تو دوسرے بیٹے اس سے حسد کرنے لگتے ہیں اور لڑنے مرنے تک کو تیار ہو جاتے ہیں۔ جن لوگوں کو اپنی بڑائی کی خواہش ہوتی ہے وہی زیادہ تر اس اخلاقی برائی میں مبتلا نظر آتے ہیں، کیوں کہ وہ کسی کو اپنے برابر نہیں دیکھ سکتے۔ مسلمانوں سے یہودیوں کے حسد اور جلن کی وجہ یہی تھی کہ اسلام نے ان کی مذہبی اور علمی برتری کو ختم کر دیا تھا۔ حسد کی جو وجوہ بتائی گئی ہیں ان کے علاوہ بعض لوگ بلا وجہ بھی حسد کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی بُری طبیعت کی وجہ سے ہر شخص کی اچھائی سے جلتے ہیں، خواہ ان کو اس سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔

اسلام نے مسلمانوں کو باہمی اخوت کے رشتے میں پرو کر حسد کے بُرے جذبے کی سخت مذمت کی ہے اور ہمیں خبردار کیا ہے کہ اگر ہم اس بُرائی میں مبتلا ہوئے تو ہم بھائی بھائی نہیں رہیں گے۔ حضورؐ نے ان تمام اخلاقی بُرائیوں سے دور رہنے کی تاکید کی ہے جو اخوت اور محبّت کو نفرت اور دشمنی میں بدل دیں۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

"بدگمانی سے بچو کیوں کہ بدگمانی سب سے زیادہ جھوٹی بات ہے۔ لوگوں کے عیب کی ٹوہ میں نہ رہو، آپس میں حسد نہ کرو، نہ ایک دوسرے سے بے تعلق رہو، نہ آپس میں بغض رکھو، بلکہ اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔"

حقیقت یہ ہے کہ حسد سب سے خطرناک اخلاقی بُرائی ہے۔ اس جذبے کو دل میں جگہ دینا سخت غلطی ہے۔ انسان کی بڑائی اس میں ہے کہ وہ اپنے ذاتی کمالات میں اضافہ کرے۔ اپنی جہالت کو دور کر کے علم کی روشنی سے اپنے دل و دماغ کو روشن کرے اور ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا کر کے حسد کو مٹا دے۔ قناعت کی خوبی پیدا کرے اور یہ اچھی طرح سمجھ لے کہ مال اور دولت سدا رہنے والی چیز نہیں۔ جو چیز باقی رہنے والی ہے وہ

محبت، اخوّت اور انسانیت ہے۔ حسد ان خوبیوں کا دشمن ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے:

"تم لوگ حسد سے بچو کیوں کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔"

بدگمانی

پُرامن اور سچا معاشرہ وہی ہوتا ہے جس کے افراد ایک دوسرے پر بھروسا کرتے ہوں۔ جہاں کسی کو کسی کی نیت پر شبہ نہ ہو، کسی کو کسی کے خلوص کے بارے میں کوئی بدگمانی نہ ہو۔ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو نہ ستائے اور کسی کو کسی کی طرف سے کوئی خطرہ نہ ہو۔ ایسی فضا جب ہی پیدا ہو سکتی ہے جب لوگ کوئی ایسا کام نہ کریں جس سے ان کے درمیان بدگمانی پیدا ہو۔ بدگمانی ایک ایسی اخلاقی برائی ہے جو نہ صرف افراد کو بلکہ پورے معاشرے کو تباہ کر ڈالتی ہے۔ ہر شخص اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے لگتا ہے اور اس سے لوگوں کا سکون اور اطمینان جاتا رہتا ہے۔

بدگمانی درحقیقت ایک ذہنی بیماری ہے اور اس بیماری کی جڑ وہم ہے۔ قرآن پاک میں اس بیماری کے بُرے اثرات بڑے اچھے طریقے سے بتائے گئے ہیں اور ہمیں اس سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اے ایمان والو! ظن اور گمان سے بہت زیادہ کام نہ لیا کرو۔ بے شک بدگمانی گناہ ہے۔"

ہر شخص کی نیت پر شبہ کرنا مسلمانوں کا طریقہ نہیں۔ انھیں تو صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ بدگمانی اگرچہ ایک ذہنی بیماری ہے لیکن اپنے بُرے اثرات کی وجہ سے اللہ کے نزدیک گناہ ہے۔

بدگمانی ایک تو وہ ہے جو لوگوں کو ایک دوسرے سے ہوتی ہے، دوسری بدگمانی

وہ ہے جس کا تعلق اللہ اور اس کے بندے سے ہے۔ بعض لوگ اللہ کی رحمت کی طرف سے بدگمان ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک گناہ ہے۔

حضورؐ نے فرمایا ہے، "اللہ کے بندو! بدگمانی سے بچو، کیوں کہ وہ سب سے جھوٹی بات ہے۔ تم دوسروں کی ٹوہ میں نہ رہا کرو اور ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی بے جا ہوس نہ کرو، نہ آپس میں حسد رکھو، نہ بُغض رکھو، نہ ایک دوسرے سے مُنہ پھیرو اور اے اللہ کے بندو! جیسا اللہ کا ارشاد ہے آپس میں بھائی بھائی بن جاؤ۔"

بدگمانی کا مرض شک و شبہ پیدا کرتا ہے اور لوگ ایک دوسرے کی ٹوہ میں لگ جاتے ہیں۔ ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت ایک شخص لایا گیا۔ لوگوں نے کہا کہ اس کی داڑھی سے شراب ٹپکتی ہے، اس لیے یہ شرابی معلوم ہوتا ہے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا، "ہمیں کسی کی ٹوہ میں رہنے سے منع کیا گیا ہے۔"

بعض اوقات بدگمانی کی وجہ سے صحیح انصاف نہیں ہو پاتا اور معاملات کے فیصلوں میں زیادتیاں ہو جاتی ہیں۔ اس لیے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کہتے ہیں کہ جس انصاف کی بنیاد بدگمانی پر ہو، وہ انصاف نہیں۔ لوگو! بدگمانی سے بچو، کیوں کہ یہ عبادتوں کو برباد کر دیتی ہے اور انسان گناہوں کے بوجھ میں دب جاتا ہے۔

حضرت علیؓ نے سچ کہا کہ جب بدگمانی دل میں گھر کر جاتی ہے تو صلح صفائی کے امکانات ختم ہو جاتے ہیں۔ یہ وہ اخلاقی بُرائی ہے جو انسان کی دوسری خوبیوں کو مٹا دیتی ہے۔ جب انسان شک و شبے میں پڑ جاتا ہے تو وہ صحیح فیصلہ نہیں کر پاتا۔

اسلام چاہتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کی طرف سے بدگمانی رکھنے کے بجائے اچھا گمان رکھیں۔ دوسروں پر بھروسا اور ان کے خلوص پر یقین انسان میں اطمینان پیدا کرتا ہے اور اللہ کی طرف سے اس اچھے گمان پر ثواب الگ ملتا ہے۔

اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان اپنے دوسرے بھائیوں سے بھی اچھا گمان رکھیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمتوں سے بھی۔ خاص طور پر اللہ کے نیک بندوں سے، کیوں کہ عام بندوں کے ساتھ بدگمانی گناہ ہے لیکن اللہ کے خاص بندوں کے ساتھ بدگمانی اس سے بھی بڑا گناہ ہے۔

نفاق

لوگوں کے آپس کے تعلّقات میں بعض اوقات ایسے نازک مرحلے پیش آجاتے ہیں جن میں بڑی احتیاط اور سمجھ داری کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر دو آدمیوں میں کسی بات پر اختلاف ہو جائے یا دونوں کو ایک دوسرے سے کچھ شکایتیں پیدا ہو جائیں اور ایک تیسرا آدمی ان دونوں سے تعلّقات رکھتا ہو۔ یہاں تک تو اعتراض کی کوئی بات نہیں ہے، بلکہ یہ ایک اچھی بات ہے کہ ان دونوں کے آپس کے اختلافات کا اس نے اپنے تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑنے دیا۔ ان دونوں آدمیوں کی بھی یہ رواداری ہے کہ وہ یہ جاننے کے باوجود اس تیسرے آدمی سے ملتے رہیں کہ وہ ان کے مخالف سے ملتا ہے۔ اصل بات جو ہے وہ یہ کہ اس تیسرے آدمی کا طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے؟ اور خاص طور پر ان دونوں کے اختلافات کے پس منظر میں اس کا کردار کیا ہونا چاہیے؟

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ اس نازک موقع پر تیسرا آدمی ایک کی بات دوسرے تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے اور دونوں کو یقین دلاتا ہے کہ وہ ان کا سچّا دوست ہے۔ اس حرکت سے دونوں کے تعلقات اور خراب ہونے لگتے ہیں اور ان کے آپس کے اختلاف جھگڑے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس جھگڑے کا سبب عام طور پر یہی تیسرا آدمی ہوتا ہے۔ یہ صورت افراد کے ساتھ بھی ہوتی ہے اور قوموں کے ساتھ بھی۔

اسلام اس حرکت اور اس کردار کو نفاق کہتا ہے اور اس کو انسان کی شدید اخلاقی پستی قرار دیتا ہے۔ یہ چغل خوری سے زیادہ بُری حرکت ہے۔ کیوں کہ چغل خور تو صرف

ایک فرد کی بات پہنچاتا ہے، منافق دونوں تک ایک دوسرے کی بات پہنچاتا ہے۔

منافقت اور دو رُخے پن کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ ایک کی بات دوسرے تک پہنچانے تک محدود ہو۔ اسلام اس گفت گو کو بھی نفاق اور دو رُخا پن ہی سمجھتا ہے جس میں اخلاص نہ ہو۔ انسان جب کوئی ایسی بات کسی سے کہے جسے خود اس کا دل تسلیم نہ کرتا ہو، یہ منافقت ہے۔ مثلاً کسی کے مُنہ پر اس کی تعریف کردی جائے اور پیٹھ پیچھے اس کی بُرائی کی جائے، یہ بھی منافقت ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مخالفوں اور منافقوں کا یہی طریقہ تھا۔

حضورؐ کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن تم دو رُخے آدمی کو سب سے بُرا پاؤگے جو کچھ لوگوں کے پاس جاتا ہے تو اس کا رُخ کچھ اور ہوتا ہے اور دوسروں کے پاس جاتا ہے تو اس کا رُخ کچھ اور ہوتا ہے۔ حضورؐ کی یہ بھی حدیث ہے کہ دنیا میں جس کے دو رُخ ہوں گے قیامت میں اس کے مُنہ میں آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔

ایک دوسرے کی بات اگر بھلائی کی نیّت سے ٹھیک پہنچادی جائے تو یہ دو رُخا پن نہیں ہے۔ منافقت تو یہ ہے کہ اپنی طرف سے کچھ جوڑ کر باتیں کہی جائیں تاکہ مخالفت بڑھے اور ساتھ ساتھ دونوں کو اپنی دوستی کا بھی یقین دلایا جائے۔

حضرت ابن عمرؓ سے کسی نے سوال کیا کہ ہم لوگ جب اپنے حاکموں کے سامنے جاتے ہیں تو کچھ اور کہتے ہیں اور جب وہاں سے نکلتے ہیں تو کچھ اور کہتے ہیں۔ آپ کے خیال میں یہ طرزِ عمل کیسا ہے؟ حضرت ابن عمرؓ نے کہا کہ ہم لوگ حضورؐ کے زمانے میں اس کو نفاق سمجھتے تھے۔

خوشامد بھی نفاق ہی کی ایک قسم ہے۔ حضرت ابو درداؓ کہتے ہیں کہ بعض لوگوں کے سامنے ہم ان کو دکھانے کے لیے ہنس دیتے ہیں۔ حال آنکہ ہمارے دل ان کو بُرا بھلا کہتے ہیں، یہ نفاق ہے۔ اس قسم کا نفاق اور دو رخا پن کسی مطلب یا غرض سے پیدا ہوتا ہے۔

بچّو! یہ بات یاد رکھو کہ جب نفاق کی دیمک قومی زندگی کی عمارت کے ستونوں کو چاٹنے لگتی ہے تو ساری عمارت دھڑام سے نیچے آجاتی ہے۔ لوگوں کے آپس کے جھگڑے

اور قوموں کی ایک دوسرے سے لڑائیاں سب اسی نفاق اور دورخے پن کا نتیجہ ہیں۔
اسلام ہمیں تاکید کرتا ہے کہ اپنے قول اور عمل کو نفاق سے پاک رکھیں، کیوں کہ جو کچھ ہم کہتے ہیں اگر اس پر عمل نہیں کرتے تو یہ عمل کا دورخا پن ہے اور اگر ہم زبان سے کچھ کہتے ہیں اور دل میں کچھ اور ہوتا ہے تو یہ قول کی منافقت ہے۔ تاریخ کا غور سے مطالعہ کرنے سے یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ قوموں کے زوال کا ایک سبب نفاق بھی ہے۔

لالچ

جس دن سے انسان اس دنیا میں آیا ہے اس کی ضرورتیں بڑھتی جارہی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض ضرورتیں ایسی ہیں جن کے بغیر ہم زندہ نہیں رہ سکتے۔ انھیں ہم فطری ضرورتیں کہہ سکتے ہیں۔ان کے پورا کرنے کی کوشش درست ہے، لیکن بے جا خواہشیں اور کبھی ختم نہ ہونے والی ضرورتیں اسلام کے نزدیک لالچ ہے. اور لالچی آدمی کبھی مطمئن نہیں ہوتا۔

حریص یعنی لالچی آدمی دولت حاصل کرنے کے لیے اخلاقی قدروں کو کچلتا ہوا پاگلوں کی طرح آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں اچھے اور بُرے اور حلال وحرام کی تمیز بھی کھودیتا ہے۔ وہ اپنے گھٹیا مقاصد کے لیے دوسروں پر ظلم کرنے اوران کا خون بہانے سے بھی باز نہیں آتا۔ اس ایک اخلاقی بُرائی کی وجہ سے اس میں اور طرح طرح کی بُرائیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ لالچی آدمی کو کبھی اطمینان اور سکون حاصل نہیں ہوتا۔ وہ ہر اس شخص کو جسے اللہ نے مال و دولت سے نوازا ہے لالچ کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ یہ مال و دولت کسی طرح اس کے قبضے میں آجائے۔ وہ دولت حاصل کرنے کے لیے جائز طریقوں سے محنت کرنے کے بجائے دوسروں کو تباہ اور اپنے آپ کو خوش حال بنانا چاہتا ہے۔ قرآنِ پاک میں اس کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

"ان چیزوں کی طرف مت دیکھو جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو

فایدہ اُٹھانے کے لیے دی ہیں۔"

لالچ کا یہی وہ جذبہ ہے جو لوگوں کو ایک دوسرے کی جان لینے اور مال چھیننے پر اُبھارتا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "لالچ سے بچو، کیوں کہ اس نے اگلوں کو دعوت دی ہے کہ وہ بے گناہوں کا خون بہائیں، اس نے اگلوں کو دعوت دی ہے کہ حرام کو حلال سمجھیں۔"

ایک دوسری حدیث میں حضورؐ نے فرمایا، "لالچ سے بچو، کیوں کہ تم سے پہلی قومیں اسی لالچ کی وجہ سے تباہ ہوئیں، انھوں نے حق کے رشتے کو کاٹا۔ لالچ ہی کی وجہ سے انھوں نے کنجوسی کی، اسی نے ان کو گناہوں کی طرف مائل کیا۔" حضورؐ نے یہ بھی فرمایا، "بُری باتوں میں انسان کو سب سے زیادہ کڑھانے والی بُرائی لالچ ہے۔"

لالچی آدمی ہمیشہ اس غم میں کڑھتا رہتا ہے کہ اسے یہ نہیں ملا، وہ نہیں ملا۔ فلاں کے پاس یہ ہے میرے پاس یہ نہیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے لالچ کو انسانیت کے خلاف قرار دیا ہے کہ اس سے شرافت جاتی رہتی ہے۔ لالچ کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اللہ پر بھروسا نہیں۔ لالچی انسان نہ اللہ کی تقسیم پر راضی ہوتا ہے اور نہ اسے اللہ کی رحمت سے کوئی امید ہوتی ہے۔ نہ وہ انسانیت اور اخلاق کا پابند ہوتا ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ دولت لالچ سے نہیں اللہ کی مرضی سے ملتی ہے، کیوں کہ آسمان اور زمین کے خزانوں کا مالک اللہ ہی ہے۔

ایک مسلمان کا مقام یہ ہے کہ وہ کبھی لالچ نہیں کرتا، کیوں کہ یہ ایمان اور اخلاق دونوں کے خلاف ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے، "ایمان اور لالچ ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔"

ایک مومن جس کا دل ایمان کی روشنی سے منوّر ہوتا ہے وہ اللہ کی دی ہوئی روزی پر قناعت کرتا ہے۔ اسے یقین ہوتا ہے کہ اگر اس نے اللہ سے ڈرتے ہوئے صحیح طریقے سے روزی کمانے کی کوشش کی تو اسے رزق میں کبھی تنگی نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے، اللہ اس کے لیے ضرور کوئی راستہ نکالتا ہے اور وہ اس کو ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے کہ وہ سمجھ بھی نہیں سکتا اور جو اللہ پر بھروسا کرے گا، اللہ اس کے لیے کافی ہوگا۔"

(الطلاق : ۲-۳)

مال اور دولت اور رزق میں ایک پر دوسرے پر فضیلت اللہ کی مصلحت کے مطابق ہے۔ ہم لالچ کرکے نہ خود دولت مند ہو سکتے ہیں اور نہ اللہ کے ان بندوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں جن کو اللہ نے دولت عطا کی ہے۔ ہاں، اپنے اخلاق کو ضرور تباہ کرسکتے ہیں۔

غیبت

غیبت ایک بہت بڑی اخلاقی بُرائی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک بُرا فعل ہے۔ اسلام غیبت کو سختی سے منع کرتا ہے۔ قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تم میں سے کوئی یہ گوارا کرے گا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟"

یعنی غیبت اتنی بُری چیز ہے جیسے اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانا۔

غیبت کے متعلق ایک عام خیال یہ ہے کہ کسی کی غیر موجودگی میں اسے بُرا کہنے کا نام غیبت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لغت میں اس کے یہی معنی ہیں، لیکن اسلامی اخلاق میں کسی آدمی کی غیر موجودگی ہی میں اسے بُرا کہنے کا نام غیبت نہیں۔ ایک مرتبہ رسول اللہؐ سے لوگوں نے پوچھا کہ غیبت کسے کہتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: "تمھارا اپنے بھائی کی اس چیز کا ذکر کرنا غیبت ہے جسے وہ ناپسند کرے۔" لوگوں نے کہا: "اگر میرے بھائی میں وہ عیب ہو تو پھر؟" حضورؐ نے فرمایا، "اگر موجود ہے تو تم نے اُس کی غیبت کی اور اگر نہیں ہے تو بہتان لگایا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ کسی کی موجودگی میں اس کی بُرائی کرنا بھی غیبت ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام بُروں کی برائیاں بیان کرنے کو بالکل روک دینا چاہتا ہے۔ قرآن نے خود کافروں کی ساری بُرائیاں کھول کھول کر بیان کی ہیں۔ مسلمان بھی ایک دوسرے کی بُرائیاں جو اُن میں موجود ہیں بیان کر سکتے ہیں، لیکن اس صورت میں کہ اس

کا مقصد اُن کی بھلائی اور اصلاح ہو۔ اس شخص کو جس پر ظلم ہوا ہو، ظالم کے ظلم وستم کی داستان بیان کرنے کا حق ہے۔ شرعی حکم معلوم کرنے کے لیے بھی بُرائیاں بیان کی جاسکتی ہیں۔ لوگوں کو کسی کے شر اور فتنے سے بچانے کے لیے بھی برائیاں بیان جاسکتی ہیں حضورؐ نے خود ایک شخص کے بارے میں فرمایا کہ یہ اپنے قبیلے کا سب سے بُرا آدمی ہے۔ کھلم کھلا بُرے کام کرنے والے آدمی کی بُرائیاں بھی بیان کی جاسکتی ہیں۔ پھر بھی اسلام آپس کے معاملات میں ان حدوں سے آگے بڑھنا پسند نہیں کرتا۔ قرآنِ پاک میں ارشاد ہے:

"اللہ تعالیٰ کو بدگوئی پسند نہیں ہے، مگر جو مظلوم ہو۔"

درحقیقت اسلام ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں ہر مسلمان کی عزت و آبرو محفوظ رہے اور ان میں آپس میں کوئی جھگڑا اور رنجش پیدا نہ ہو۔ اسلام مسلمانوں میں کوئی ایسی برائی دیکھنا نہیں چاہتا جس سے ان کی عزت و آبرو کو نقصان پہنچے اور جو انسانیت اور شرافت کے خلاف ہو۔

غیبت کی عادت سے انسان میں عیب جوئی یعنی دوسروں کی بُرائیاں تلاش کرنے کی عادت پیدا ہوتی ہے جو اخلاق سے گری ہوئی بات ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے:

"لوگو! نہ مسلمانوں کی غیبت کرو، نہ ان کے عیب تلاش کرو، کیوں کہ جو شخص ان کے عیبوں کی تلاش میں رہے گا اللہ بھی اس کی عیب جوئی کرے گا اور اللہ جس کی عیب جوئی کرے گا اس کو اس کے گھر کے اندر ہی رُسوا کر ڈالے گا۔"

غیبت انسانی خوبیوں کو تباہ کر دیتی ہے۔ اس سے لوگوں میں آپس میں دشمنی پیدا ہوتی ہے جو کبھی کبھی بڑھ کر پورے معاشرے میں پھیل جاتی ہے۔ حسد، تکبّر اور بدگمانی لوگوں کو غیبت پر ابھارتی ہے۔ اسلام یہ چاہتا ہے کہ ایک مسلمان ان تمام اخلاقی برائیوں سے پاک ہو۔ اس لیے غیبت چاہے وہ زبان سے ہو یا کسی اور شکل میں منع ہے۔ ہم جب بھی کسی کا ذکر کریں، اپنے دل کو ٹٹولیں اپنے الفاظ کو تول لیں، کیوں کہ ہمارے مُنہ سے نکلنے والی ہر بات کو فرشتے لکھ لیتے ہیں۔

حضورؐ نے غیبت کرنے کو ہی ناپسند نہیں فرمایا ہے، بلکہ غیبت سننے کو بھی ناپسند کیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا ہے کہ جس نے دوسروں کے بارے میں ایسی بات سنی ہو جو اُسے

ناگوار ہو تو اس کے کان میں قیامت کے دن پگھلا ہوا سیسا ڈال دیا جائے گا۔
حضورؐ سے لوگوں نے پوچھا کہ غیبت کے گناہ کا کفارا کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا:
"جس کی تم نے غیبت کی ہے اس کی مغفرت کے لیے اللہ سے دعا کرو، یہی کفارا ہے۔"

نرمی اور برداشت

نرمی اور برداشت ایسی اخلاقی خوبیاں ہیں جو انسان کے لیے کام یابی، عزّت اور ترقی کا ذریعہ بنتی ہیں۔ ان کی وجہ سے آدمی کبھی غصّے سے بے قابو نہیں ہوتا۔ اگر کبھی کوئی بات اس کی مرضی کے خلاف ہوتی ہے اور اس سے اس کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ شور نہیں کرتا اور صبر و ضبط سے کام لے کر تکلیف برداشت کرلیتا ہے۔

انسان کو اللہ نے بہترین فطرت پر پیدا کیا ہے اور اس کی فطرت میں یہ جذبہ رکھا ہے کہ وہ اچھی باتوں کی طرف مائل ہوتا ہے اور بُرائیوں سے بچتا ہے۔ اچھی عادتیں انسان کو فطرتاً پسند ہوتی ہیں اور بُری عادتوں کو وہ ناپسند کرتا ہے۔ نیکی سے اس کو محبت ہوتی ہے اور بدی سے نفرت۔ یہ خصوصیت کسی خاص قوم یا قبیلے تک محدود نہیں، بلکہ ہر انسان اور ہر قوم اچھے اخلاق اور اچھی خوبیوں کو دل سے پسند کرتی ہے۔ اور اخلاقی برائیوں سے نفرت کرتی ہے۔ جھوٹ، دھوکا، فریب، ظلم، ناانصافی، تشدد، بدکلامی، غیبت، چغل خوری، فساد اور اسی قسم کی دوسری بُرائیوں کو کبھی اچھا نہیں سمجھا گیا ہے اور نہ کہا گیا ہے۔ اس کے برعکس سچائی، صاف گوئی، ہمدردی، ایثار، دوستی، رحم، انصاف، خلوص، خوش مزاجی، اچھی گفت گو، صلح صفائی، نرمی اور برداشت کو ہمیشہ اور ہر قوم میں بہترین سمجھا گیا اور جن لوگوں اور قوموں میں یہ خوبیاں ہوتی ہیں ان کی عزت کی جاتی ہے۔ جن لوگوں میں یہ خوبیاں نہیں ہوتیں انھیں اس پر افسوس ہوتا ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ ان میں یہ خوبیاں پیدا ہو جائیں۔ اگر کسی میں کوئی

برائی، کوئی عیب ہوتا ہے تو وہ اس کو چھپاتا ہے اور اس پر شرمندہ ہوتا ہے۔

یہ بات خود ثابت کرتی ہے کہ اچھے اخلاق یقیناً پسندیدہ ہوتے ہیں اور ان سے آدمی کی عزت ہوتی ہے۔ مسلمان خصوصیت کے ساتھ نیکیوں کو پسند کرتا ہے اور برائیوں سے نفرت کرتا ہے وہ نیک لوگوں کی تعریف کرتا ہے اور بُرے لوگوں کا مخالف ہوتا ہے۔ اس کی زندگی کا تو مقصد ہی یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ اچھی باتوں کا حکم دیتا ہے اور بُری باتوں سے روکتا ہے۔ نیکی کو پھیلانا اور برائیوں کو دور کرنا اس کے فرائض میں داخل ہے۔ حضورؐ کو اچھے اخلاق سکھانے کے لیے ہی بھیجا گیا تھا۔

ایک مرتبہ ایک شخص حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا، "اے اللہ کے رسولؐ! مجھے کچھ نصیحت فرمائیے۔"

آپ نے فرمایا، "غصہ نہ کیا کرو۔"

اس نے کہا، "کچھ اور نصیحت فرمائیے۔"

آپؐ نے پھر بھی کہا، "غصہ نہ کیا کرو۔" اور کئی بار یہی بات دہرائی۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کا ارشاد ہے کہ غصہ ایک قسم کا پاگل پن ہے۔ غصہ کرنے والا بعد میں خود نادم ہوتا ہے اور اگر وہ نادم نہ ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ پاگل ہو گیا ہے۔ غصہ کرنے والے اور غصے میں قابو سے باہر ہو جانے والے انسان کو کوئی سمجھ دار نہیں کہتا۔ غصے سے بے قابو ہو جانے والے آدمی کو پچھتانا پڑتا ہے۔

نرمی اور برداشت کے ذریعہ سے انسان بڑی سے بڑی مشکل پر قابو پالیتا ہے۔ ایک ایسا آدمی جس میں نرمی اور برداشت ہوتی ہے نہ صرف یہ کہ لوگوں میں پسند کیا جاتا ہے، بلکہ وہ خود بھی چین اور آرام سے رہتا ہے۔ جب کوئی آدمی اپنے عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ خلوص اور محبت سے پیش آتا ہے اور ان کے دکھ درد میں بھی شریک ہوتا ہے ان کے لیے تکلیفیں برداشت کرتا ہے تو اس سے اس میں روحانی بلندی پیدا ہوتی ہے، اس کا دل نرم ہو جاتا ہے اور اس میں صبر، برداشت، تحمّل اور بُردباری جیسی اعلا صفات پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ قوم اور معاشرے کے لیے خیر و برکت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جو مسلمان، لوگوں کے ساتھ مل کر رہتا ہے اور ان کی طرف

پہنچنے والی تکلیفوں کو برداشت کرتا ہے وہ اس شخص سے کہیں بہتر ہے جو لوگوں سے الگ تھلگ رہتا ہے اور ان کی طرف سے پہنچنے والی تکلیفوں سے بد دل ہو جاتا ہے۔

نرمی اور برداشت ایسی خوبی ہے جو خود اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

"اللہ تعالیٰ بڑا معاف کرنے والا بُردبار ہے۔"

(البقرہ : ۲۲۵)

ایک بار ایک دیہاتی حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے مسجد کے صحن میں بیٹھ کر پیشاب کر دیا۔ کچھ لوگ اسے مارنے کو دوڑے۔ حضورؐ نے دیکھا تو انھیں روکا اور فرمایا، "اسے کیوں مارتے ہو؟ ایک ڈول پانی بہا دو۔ اس اُمّت کو تو لوگوں کو آسانیاں فراہم کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے، انھیں مشکل میں ڈالنے کے لیے نہیں۔"

ایک بار حضورؐ کہیں تشریف لے جا رہے تھے۔ آپؐ کے صحابی ساتھ تھے۔ حضورؐ موٹے کپڑے کی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ ایک دیہاتی نے چادر پکڑ لی اور اس طرح گھسیٹی کہ آپؐ کی گردن پر نشان پڑ گئے لیکن حضورؐ نے ایک لفظ بھی نہ کہا بلکہ مسکراتے ہوئے فرمایا کہ کیا بات ہے؟ اس نے اپنی ضرورت بتائی جو حضورؐ نے پوری فرما دی۔

رسول اللہؐ کی پاکیزہ زندگی تحمّل و بردباری، نرمی اور برداشت کے بے شمار واقعات سے بھری پڑی ہے۔ سچّی بات تو یہ ہے کہ جتنا تحمل، نرمی اور برداشت حضورؐ میں تھی وہ کسی دوسری ہستی میں ملنی مشکل ہے۔ تاریخ آپؐ جیسا نرم مزاج اور قوّت برداشت رکھنے والا انسان کوئی دوسرا پیش کر ہی نہیں سکتی۔ اسلام پھیلانے میں حضورؐ کو جن جن مشکلوں اور جیسی جیسی تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا ہم اس کا تصوّر کر کے بھی کانپ جاتے ہیں۔ یہ سب پریشانیاں اور تکلیفیں آپؐ نے ہنسی خوشی برداشت کیں اور اللہ نے جو کام آپؐ کو سونپا تھا اسے انجام دینے میں لگے رہے۔

شرم و حیا

شرم و حیا انسان کی ایسی خوبی ہے جو اسے بہت سی بُرائیوں سے محفوظ رکھتی ہے۔ در حقیقت شرافت اور پاکیزگی کی بنیاد ہی حیا ہے۔

ایک پودا چھوئی موئی کا ہوتا ہے کہ اگر کوئی اس کو چھُولے تو سمٹ جاتا ہے۔ اسے لجونتی یعنی شرم و حیا کا پودا کہتے ہیں۔ ایسا پودا جسے یہ بھی گوارا نہیں کہ کوئی اسے چھوئے۔ یہی حال حیادار انسان کا ہوتا ہے۔ وہ اگر کبھی بے ہودہ باتیں کرنے والوں کے پاس سے گزرتے ہیں تو شرم سے گردن جھکا کر تیزی سے گزر جاتے ہیں۔ اگر اتفاق سے ان کی نظر کسی بُرے کام پر پڑ جاتی ہے تو شرم سے پانی پانی ہو جاتے ہیں اور نگاہیں پھیر لیتے ہیں۔ وہ ایسا کوئی کام نہیں کرتے جس پر لوگ انگلی اُٹھائیں۔ حیادار انسان کو بُرائی سے نفرت ہو جاتی ہے۔ وہ انسان کی شکل میں فرشتے ہوتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شرم و حیا کا نمونہ تھے۔ آپؐ لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلے تھے۔ حضورؐ کو حیا اتنی تھی کہ آپؐ کے صحابہ آپؐ کے پاس دیر تک بیٹھے رہتے تھے جس سے بعض اوقات آپؐ کو تکلیف بھی ہوتی تھی، لیکن آپؐ شرم و حیا کی وجہ سے ان سے کچھ نہ کہتے تھے۔ یہاں تک کہ قرآنِ پاک کی وہ آیت اتری جس میں اللہ تعالیٰ نے صحابہؓ کو مخاطب کر کے فرمایا:

"تم دیر تک رسول اللہ صلی پاس بیٹھے رہتے ہو جس سے آپؐ کو تکلیف ہوتی ہے لیکن آپؐ شرم کے مارے اپنی تکلیف کا اظہار نہیں کرتے۔" (احزاب: ۵۲)

شرم وحیا انسان میں پیدائشی طور پر ہوتی ہے کسی میں زیادہ کسی میں کم۔ اگر اچھا ماحول ملے اور اچھی تربیت بھی کی جائے تو نہ صرف یہ خوبی باقی رہتی ہے، بلکہ اس میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف بُرے ماحول اور بری صحبت سے شرم وحیا کم ہوتی جاتی ہے اور بے حیائی اور بے شرمی بڑھتی جاتی ہے۔ اس لیے اسلام نے ان تمام باتوں سے منع کیا ہے جو اس خوبی کو کم کرنے والی ہیں۔ قرآنِ حکیم بعض بُرائیوں کے بارے میں ہدایت فرماتا ہے، "ان باتوں کے قریب بھی نہ جانا"۔ یہ احتیاط اس وجہ سے ہے کہ آنکھوں میں شرم باقی رہے اور دیدے کا پانی نہ مر جائے۔ دیدوں کا پانی مر جانا اس وقت بولتے ہیں جب شرم وحیا باقی نہ رہے۔

حضورؐ کے ایک صحابی بہت شرمیلے تھے اور حیادار تھے۔ اس پر اُن کا بھائی ان کو بُرا بھلا کہہ رہا تھا۔ حضورؐ نے دیکھا تو فرمایا، "اس پر غصّہ نہ کرو، کیوں کہ حیا ایمان سے ہے"۔ یعنی حیا ایمان کا حصّہ ہے۔ جس طرح ایمان کا تقاضا ہے کہ آدمی تمام بُری باتوں اور بُرے کاموں سے بچے، اسی طرح حیا بھی تمام بُرائیوں بلکہ بُرے خیالات تک سے انسان کو روکتی ہے۔ حیا انسان کی ایک ایسی خوبی ہے جس کے بارے میں رسول اللہؐ کا ارشاد ہے:

"حیا سے صرف بھلائی ہی پہنچتی ہے"۔

ایسی خوبی جس میں بھلائی ہی بھلائی ہو، جو حضورؐ کے ارشاد کے مطابق ہمارے ایمان کا آدھا حصّہ ہو اس کی تو ہمیں پوری حفاظت کرنی چاہیے تاکہ ہم بُرائیوں سے بچے رہیں اور نیکی اور شرافت کی زندگی بسر کر سکیں۔

صحابہ کرامؓ جن کی تربیت اللہ کے رسولؐ نے فرمائی تھی، ان کی زندگیوں میں بھی شرم وحیا کا وصف نمایاں نظر آتا ہے۔ حضرت عثمان غنیؓ کے بارے میں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ ان کی شرم وحیا پر فرشتے بھی رشک کرتے ہیں۔ حضورؐ نے ایک مرتبہ یہ بھی فرمایا:

"اگر تم شرم وحیا نہیں کرتے تو پھر جو چاہے جو بُرائی کرتے رہو کوئی تمھیں روکنے والا نہیں"۔

شرم وحیا اور اس کی اہمیت اور بڑائی کے ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل

ہے کہ ایسی شرم وحیا جو آدمی کو بھلائی کے کاموں اور علم حاصل کرنے سے روکے غلط ہے۔ اگر کوئی شخص کسی چیز سے واقف نہیں ہے تو کسی جاننے والے سے پوچھ لینے میں اس کو شرم نہیں کرنی چاہیے۔

حلال روزی

ہم پر اللہ کا بڑا کرم ہے کہ اس نے ہمیں زبان دی ہے۔ اس کے ذریعہ سے ہم ایک دوسرے تک اپنی بات پہنچا سکتے ہیں۔ یہ اس کا فضل ہے کہ اس نے ہمیں عقل دی ہے، سوچنے سمجھنے کی قوت دی ہے، فیصلے کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ اللہ کا اس سے بھی بڑا فضل یہ ہے کہ اس نے ہمیں ہر جان دار اور بے جان پر برتری عطا کی ہے، ہمیں اچھے اور بُرے کی تمیز سکھائی ہے تاکہ ہم اس دنیا میں اپنے لیے سیدھے راستے کا فیصلہ کر سکیں۔

ذرا سوچو کہ اگر ہمیں یہ صلاحیتیں نہ دی جاتیں تو ہم میں اور جانوروں میں کیا فرق ہوتا۔ اگر انسان کے پاس زبان نہ ہوتی، سوچنے سمجھنے کی قوت نہ ہوتی اور اگر وہ عقل سے محروم ہوتا تو وہ بھی دوسرے جانوروں کی طرح ایک جانور ہوتا۔ جب انسان کو جانوروں پر برتری حاصل ہے تو اس کا اظہار بھی ہونا چاہیے۔ اسے اپنے عمل اور کردار سے یہ ثابت کرنا چاہیے کہ وہ جانوروں سے بہتر ہے۔

بچو! تم نے دیکھا ہوگا جب کسی جانور کو بھوک یا پیاس لگتی ہے تو جہاں اسے کچھ کھانے کو یا پینے کو ملتا ہے وہیں کچھ سوچے سمجھے بغیر منہ ڈال دیتا ہے۔ کسی کا مال ہڑپ کر جاتا ہے اور اسے اس کے جائز اور ناجائز میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ وہ حلال اور حرام میں کوئی تمیز نہیں کر سکتا، کیوں کہ وہ ایک جانور ہے۔ نہ اس کے پاس عقل ہے اور نہ سمجھ۔

ایک بزرگ تھے، وہب ابن ابو دود، ان کا مزاج یہ تھا کہ وہ اس وقت تک کوئی چیز نہ کھاتے تھے، نہ پیتے تھے جب تک ان کو یہ نہیں معلوم ہو جاتا کہ یہ چیز کہاں سے آئی ہے اور کیسے آئی ہے۔ ایک دن ان کی والدہ نے ان کو دودھ کا ایک پیالہ پینے کو دیا۔ انھوں نے پوچھا، "یہ دودھ کہاں سے آیا ہے؟ اس کی قیمت کہاں سے دی گئی ہے اور کس آدمی سے خریدا گیا ہے؟ وہ یہ سب کچھ معلوم کر چکے لیکن اطمینان نہ ہوا۔ آخر میں پوچھا کہ جس بکری کا یہ دودھ ہے اس نے چارا کہاں سے کھایا تھا؟ انھیں معلوم ہوا کہ اس بکری نے ایک ایسی جگہ سے گھاس کھائی ہے جس پر مسلمانوں کا کوئی حق نہیں تھا۔ لہٰذا انھوں نے دودھ پینے سے انکار کر دیا۔

جب ان کی والدہ نے بہت زور دیا تو کہنے لگے:

"بے شک اللہ رحمٰن ہے اور رحیم ہے۔ وہ رحمت کرنے والا ہے۔ میں اس کی رحمت کو گناہ سے آلودہ نہیں کر سکتا۔"

ایک مرتبہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ایک شخص ملا۔ انھوں نے اس سے پوچھا:

"کیا کام کرتے ہو؟"

اس نے کہا، "عبادت کرتا ہوں۔"

حضرت عیسیٰؑ نے پھر پوچھا: "کھانا کہاں سے کھاتے ہو؟"

اس نے جواب دیا: "میرا ایک بھائی ہے جو مجھے کھانا کھلاتا ہے۔"

حضرت عیسیٰؑ نے کہا، "پھر تو تمھارا بھائی تم سے زیادہ عبادت کرنے والا ہے۔"

ان دو واقعات سے حلال روزی کی اہمیت معلوم ہو جاتی ہے۔ یعنی یہ کہ حلال روزی وہ ہے جو انسان اپنی محنت سے پیدا کرے اور جو جائز طریقوں سے کمائی جائے۔ اسلام دولت کمانے کی اجازت دیتا ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ جائز طریقوں سے کمائی جائے۔ کمائی کے وہ تمام طریقے اور راستے ناجائز ہیں جن میں ایک شخص کا فائدہ دوسرے شخص کے نقصان سے ہو۔ قرآنِ پاک میں اس اصول کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

"اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال غلط طریقوں سے نہ کھایا کرو سوائے اس کے کہ آپس کی رضامندی کے ساتھ تجارت ہو اور تم خود

اپنے آپ کو ہلاک نہ کرو۔ اللہ تمھارے حال پر مہربان ہے۔ جو کوئی اپنی حد سے بڑھ کر ظلم کے ساتھ ایسا کرے گا اس کو ہم آگ میں جھونک دیں گے۔"

(النساء: ۲۹-۳۰)

قرآن مجید جن ذرائع سے حاصل کی ہوئی روزی کو حرام قرار دیتا ہے ان میں رشوت، خیانت، چوری، زور، زبردستی، یتیم کے مال میں سے غلط طریقے سے لینا، ناپ تول میں کمی، شراب اور گندے کاروبار سے آمدنی، جوا، بُت فروشی، سود اور فال نکالنے اور قسمت کا حال بتانے سے ہونے والی آمدنی شامل ہے۔

حلال روزی صرف اسی طرح حاصل ہو سکتی ہے کہ انسان محنت کرے، دیانت داری سے کام کرے، کسی کا حق نہ مارے، کسی کو تکلیف نہ دے، اپنے فرائض اور دوسروں کے حقوق کا خیال رکھے اور یہ سمجھ لے کہ رزق دینے والا اللہ ہی ہے، وہی حلال روزی عطا کرتا ہے اور اسی سے یہ دعا کرنی چاہیے کہ وہ ہمیں سیدھے راستے پر چلائے۔

قناعت حلال روزی کی بنیادی خصوصیت ہے۔ قناعت یہ ہے کہ انسان اپنی ضرورت کو بلاوجہ نہ پھیلائے، انھیں جائز حد میں رکھے اور جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس پر صبر اور شکر کرے۔

قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

"حلال چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو۔"

نیک عمل انسان کو سیدھے راستے پر چلاتا ہے اور اسے حلال اور حرام میں تمیز کرنے کی صلاحیت بخشتا ہے لیکن اگر انسان حلال اور حرام میں فرق کرنا چھوڑ دے اور حرام کھانے لگے تو وہ نیک عمل سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک مرتبہ فرمایا، "کوئی بندہ حرام مال کمائے، پھر اس میں سے اللہ کی راہ میں صدقہ دے تو یہ صدقہ قبول نہیں کیا جائے گا اور اگر وہ یہ مال اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرے گا تو اس میں برکت نہیں ہوگی اور اگر وہ اس مال کو چھوڑ کر مرا تو یہ مال اس کو جہنم میں لے جائے گا۔ اللہ بُرائی کو بُرائی سے نہیں، بلکہ بُرے عمل کو اچھے عمل سے مٹاتا ہے۔"

حضورؐ نے یہ جو کچھ فرمایا ہے اس کی روشنی میں ہمیں اپنے حالات کا جائزہ لینا چاہیے۔ اگر ہم غلط راہ پر چل رہے ہیں تو سیدھی راہ اختیار کر لینی چاہیے۔ سیدھی راہ یہ ہے کہ ہم نیک عمل کریں، ایک دوسرے سے محبت کریں، کسی کو تکلیف نہ پہنچائیں، اپنی روزی حلال ذریعوں سے کمائیں، اپنی محنت سے پیدا کریں، جو مل جائے اس پر قناعت کریں اور امانت اور دیانت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ بے شک اللہ کے ایسے بندوں کے لیے برکت ہی برکت ہے۔

جو لوگ غلط راستہ اختیار کرتے ہیں، وہ کبھی خوش اور مطمئن نہیں رہتے۔ وہ اس دنیا میں بھی خوار رہتے ہیں اور آخرت میں بھی سزا پائیں گے۔ حلال روزی اللہ کا فضل ہے، اس کا انعام ہے۔

کام چوری

اسلام کے نزدیک خیانت ایک بہت بڑا جرم ہے۔ خیانت میں جھوٹ، بے ایمانی، دھوکا، فریب اور دغابازی جیسی ساری بُرائیاں شامل ہیں۔ سب سے پہلے خیانت کے معنی سمجھ لینے چاہییں۔ ایک انسان کا جو حق دوسرے انسان پر ہو اسے ایمان داری سے ادا نہ کرنا، خیانت اور بد دیانتی ہے۔ عام طور پر لوگ خیانت کا مطلب صرف یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ایک چیز کسی نے دوسرے کو امانت کے طور پر دی ہو اور وہ اس چیز کو ہتھیا لے اور مانگنے پر نہ دے یا اس کو غلط طریقے پر استعمال کرلے تو یہ خیانت ہے۔ اس میں شک بھی نہیں کہ یہ کھلی خیانت ہے لیکن خیانت کے صرف یہی معنی نہیں۔ اور بھی کئی باتیں خیانت میں آجاتی ہیں۔ مثال کے طور پر کسی کی کوئی چھپی ہوئی بات کسی دوسرے کو معلوم ہو یا کسی نے دوسرے پر بھروسا کرکے کوئی اپنا بھید اس کو بتایا ہو تو اس کا کسی اور پر ظاہر کرنا بھی خیانت ہے۔ اسی طرح جو کام کسی کو سونپا گیا ہو اس کو وہ ایمان داری کے ساتھ پورا نہ کرے تو یہ بھی بہت بڑی خیانت ہے۔ اسی طرح عام مسلمانوں کے خلاف کوئی کام کرنا بھی بد دیانتی ہے۔ دوست ہوکر دوستی نہ نبھانا بھی خیانت ہے۔ دل میں کچھ رکھنا اور زبان سے کچھ کرنا بھی خیانت ہے۔ اسلام کے نزدیک یہ سب باتیں خیانت ہیں اور منع ہیں۔

کام چوری بھی ایک خیانت ہے۔ اس میں جھوٹ اور چوری، دھوکا اور فریب جیسی برائیاں شامل ہیں۔ ان تمام برائیوں سے بڑھ کر ایک اور بُرائی یہ ہے کہ کام

چوری کے ذریعے سے جو رزق حاصل کیا جائے گا اُسے حلال روزی نہیں کہا جا سکتا اور حلال روزی کی اہمیت کا حال یہ ہے کہ اگر حلال رزق نہ کھایا تو نہ عبادت قبول ہوتی ہے اور نہ ایسے آدمی کی دُعا۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے:

"کوئی آدمی حرام مال کھائے، پھر اُسے اللہ کی راہ میں صدقہ کرے تو یہ صدقہ اس کی طرف سے قبول نہیں کیا جائے گا اور اگر اپنی ذات اور اپنے گھر والوں پر خرچ کرے گا تو اس میں برکت نہ ہوگی اور اگر وہ اس کو چھوڑ کر مرا تو وہ اس کے جہنّم کے سفر کا سامان بنے گا۔"

قرآنِ پاک میں سورۃ قصص میں اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا جب حضرتِ موسیٰؑ نے حضرت شعیبؑ کی بکریوں کو پانی پلا دیا تو حضرت شعیبؑ کی بیٹی نے باپ سے کہا، "بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھنا چاہیں وہ ہے جو مضبوط بھی ہو اور دیانت دار بھی۔"

قرآنِ مجید میں لفظ "امین" استعمال ہوا ہے جس کے معنی ایمان دار اور دیانت دار کے ہیں۔ یعنی ملازم کے لیے ایک نہایت اہم شرط یہ بھی ہے کہ وہ خیانت نہ کرتا ہو یعنی کام چور نہ ہو، کیوں کہ ملازم کی خیانت یہی ہے کہ وہ وقت مقررہ کے اندر ایمان داری اور محنت کے ساتھ کام نہ کرے۔ اگر وہ جان بوجھ کر کاہلی اور سُستی کرتا ہے یا کام پورا پورا نہیں کرتا تو اللہ اور اس کے رسولؐ کی نظر میں وہ بہت بڑا خیانت کرنے والا ہے۔

حضورؐ جن بُری باتوں سے اللہ کی پناہ مانگا کرتے تھے ان میں سے ایک خیانت بھی ہے۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے، "اے اللہ! مجھے خیانت سے بچائے رکھنا کہ یہ بہت بُرا اندرونی ساتھی ہے۔"

حضورؐ نے محنت مزدوری کر کے روزی کمانے کو سب سے حلال چیز قرار دیا ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ کام چوری نہ کی جائے۔ اگر محنت مزدوری میں کام چوری کی جائے تو یہ رزق، حلال کے بجائے حرام ہو جائے گا۔

کام چوری کا مطلب یہ ہے کہ مقررہ وقت میں اور مقررہ اُجرت میں اتنا کام نہ کیا جائے جتنا کرنا چاہیے یا کام میں سُستی اور کاہلی برتی جائے۔ یعنی جتنا کام جتنے وقت

میں پورا کرنا ٹھیرا ہو وہ تو نہ کیا جائے مگر اُجرت پوری وصول کرلی جائے تو یہ خیانت ہوگی اور اس طرح سے کمایا ہوا رزق حرام ہو جائے گا۔

یہ بات صاف ہے کہ نماز امانت ہے۔ وضو امانت ہے۔ ناپ تول امانت ہے اور محنت اور ایمان داری سے کام کرنا بھی امانت ہے۔ اگر کوئی کام کرنے والا پیداوار کی مقررہ مقدار اپنی کام چوری کی وجہ سے نہیں دے سکتا تو اس کی مثال ایسی ہے کہ اس نے امانت پوری پوری واپس نہیں کی اور خیانت کا مجرم ہوا۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اے ایمان والو! تم ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقوں سے مت کھاؤ۔"

یہ آیت ایک اصول بتاتی ہے اور وہ یہ کہ ہر وہ مال حرام ہے جو کسی ناجائز طریقے سے حاصل کیا گیا ہو۔ کام چوری میں بھی کم کام کر کے زیادہ اُجرت وصول کرنا شامل ہے جو یقیناً ناجائز ہے۔

صفائی اور پاکیزگی

اسلام نے زندگی کے ہر شعبے میں اعلا اُصول دیے ہیں اور ساری دنیا نے ان کو اپنایا ہے، ان سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ کسی مذہب کی اس سے بڑھ کر اور کیا عظمت ہو سکتی ہے کہ دنیا کی ساری قومیں اس کی دی ہوئی تعلیم سے فائدہ حاصل کریں۔ مسلمانوں کو اس پر بجا طور پر فخر کرنا چاہیے اور ان حقیقتوں کو نہیں بھولنا چاہیے جو اسلام کی عظمت اور سربلندی کا ذریعہ ہیں۔

جب میں غور کرتا ہوں تو اسلام کی اس عظمت اور سربلندی کے اسباب بہت زیادہ ہیں، لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان میں سب سے اہم اسلام میں صفائی اور پاکیزگی کا معیار ہے۔ صفائی اور پاکیزگی اسلامی نظام کا ایک اہم اور مضبوط ستون ہے۔ اسلام نے زندگی کے جو اُصول بتائے ہیں وہ اس قدر آسان اور سادہ ہیں کہ دنیا کا ہر ملک اور ہر قوم ان پر آسانی کے ساتھ عمل کر سکتی ہے۔ چوں کہ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے، اس لیے اس کی دی ہوئی ہدایات بھی ایسی ہیں کہ دنیا کا ہر فرد ان پر عمل کر سکتا ہے۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام سے پہلے دنیا کا کیا حال تھا۔ جہاں تک جسم کی صفائی کا تعلق ہے دنیا کا یہ حال تھا کہ نہانا، ناخن کاٹنا اور صفائی کا اہتمام کرنا منع تھا۔ قرآنِ پاک نے سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ صفائی اور طہارت پر زور دیا اور ابتدا اس سے ہوئی کہ قرآنِ پاک کو صرف وہی لوگ ہاتھ لگا سکتے ہیں جو پاک اور صاف ہوں۔ پھر ارشاد ہوا کہ اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو پاک ہوں۔

ایک بنیادی بات ہمیشہ ذہن میں رہنی چاہیے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"تمھارے لیے اللہ کا رسولؐ بہترین نمونہ ہے۔"

حضورؐ کا ہر کام قرآنی تعلیم کے مطابق تھا۔ قرآن جب زندگی کا نظام بن کر نازل ہوا تو اس پر عمل کرنے اور عمل کرانے والے رسول اللہؐ ہی تھے۔ اگر قرآن پر عمل نہ ہوتا تو یہ محض قانون کی ایک کتاب بن کر رہ جاتا۔ قرآن پر بڑی احتیاط کے ساتھ صحیح صحیح عمل ہوا۔ حضورؐ نے عمل کیا، آپؐ کے صحابیوں نے عمل کیا اور دوسرے بزرگانِ دین نے عمل کر کے دکھایا۔

صفائی اور پاکیزگی پر زور دیتے ہوئے حضورؐ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ خود پاک ہے اور پاک چیز پسند فرماتا ہے۔"

ایک اور موقع پر آپؐ نے کہا:

"صاف ستھرے رہا کرو کہ اسلام پاکیزہ مذہب ہے۔"

پھر ارشاد ہوا:

"اللہ تعالیٰ میل کچیل اور بکھرے بال پسند نہیں فرماتا۔"

حضورؐ کی ان حدیثوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام پر چلنے کے لیے صفائی اور پاکیزگی پہلی شرط ہے۔ اللہ نے اپنے نبیؐ کو یہ تاکید فرمائی تھی: "اپنے لباس کو صاف ستھرا رکھو اور ہر قسم کی گندگی سے پرہیز کیا کرو۔" گندگی سے مُراد ہر قسم کی گندگی ہے خواہ کپڑوں کی ہو، جسم کی ہو، روح کی ہو یا ماحول کی ہو۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب یہ ہدایت جاری ہوئی تھی اس وقت عرب میں پانی کی کمی تھی۔ کوئی سہولت میسّر نہ تھی۔ اس کے باوجود اسلام نے غسل پر زور دیا اور دن میں پانچ بار نماز کے لیے وضو کو لازمی قرار دیا۔ اس سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلام میں طہارت اور پاکیزگی کی کتنی اہمیت ہے۔

اسلام کی ایک خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر اچھا کام عبادت ہے۔ راستے کو جھاڑ جھنکار سے صاف کر دینا، ناپاکی اور گندگی کو دُور کر دینا، کوڑے کرکٹ اور گندگی سے نہ صرف خود بچنا بلکہ دوسروں کو بھی بچانا، یہ سب نیک اور اچھے کام ہیں اور عبادت ہیں۔

بچو! اگر تم نے پرانے زمانے کے حالات پڑھے ہوں گے تو محسوس کیا ہو گا کہ مسلمانوں کی مجلسوں اور محفلوں میں اور ان کے گھروں میں چاہے وہ امیروں کی حویلیاں ہوں یا غریبوں کی جھونپڑیاں صفائی کا خاص انتظام ہوتا تھا۔ یہ صورت آج تک کسی نہ کسی حد تک برقرار ہے۔ صاف ستھرا فرش ہوتا تھا، محفلوں میں لوگوں پر گلاب اور کیوڑے کا عرق چھڑکا جاتا تھا، لباس صاف ستھرا ہوتا تھا اور کپڑوں میں عطر لگایا جاتا تھا۔ امیر آدمی قیمتی عطر لگاتے تھے، غریب پانچ دس پیسے کی عطر کی پھریری لے کر اپنے ہاتھوں اور رومال کو خوش بو میں بسا لیتے تھے۔ برتنوں کے دھونے اور مانجھنے میں بھی صفائی کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔

آج بھی جب کہ مسلمان اپنی بہت سی اچھی عادتیں بھلا چکے ہیں، ان میں صفائی اور پاکیزگی کی عادت باقی ہے۔ البتہ ایک فرق ہوا ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنی ذات کی حد تک تو صفائی کا بڑا خیال رکھتے ہیں لیکن انھوں نے اپنے ماحول کی صفائی پر توجہ کرنی چھوڑ دی ہے۔

بچو! یاد رکھو اگر ماحول صاف ستھرا نہیں، آبادی اور محلّے کی فضا پاک اور صاف نہیں تو ذاتی صفائی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ دونوں چیزیں ضروری ہیں اپنی اور اپنے گھر کی صفائی بھی اور اپنے محلے، اپنی بستی اور اپنے شہر کی صفائی بھی۔

ایک آزاد اور زندہ قوم کی حیثیت سے ہمیں اپنی اس عادت کو پھر اختیار کرنا ہے جس نے ہمارے کردار اور سیرت کو جلا بخشی۔ یہ کام مشکل نہیں۔ بس پکّا ارادہ کرنے کی ضرورت ہے۔

صحت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ہزاروں نعمتیں دی ہیں۔ بعض نعمتوں کا تو انسان کو احساس ہو جاتا ہے لیکن بعض نعمتیں ایسی ہیں اور اتنی زیادہ ہیں کہ ان کی زیادتی کی وجہ سے ان کے نعمت ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ ہوا اور پانی کتنی بڑی نعمتیں ہیں۔ زندگی کا دارومدار ہی ان دو نعمتوں پر ہے لیکن یہ نعمتیں اتنی عام ہیں کہ ان کی قدر نہیں ہوتی۔ ہاں جب یہ نعمتیں چھن جاتی ہیں تو ان کی قدر معلوم ہوتی ہے۔

صحت بھی ایک ایسی ہی نعمت ہے۔ اس کی قدر بھی انسان عام طور پر نہیں کرتا۔ جب تک اس کے ہاتھ پاؤں ٹھیک کام کرتے رہتے ہیں اور اسے کوئی تکلیف نہیں ہوتی اسے صحت کے وجود ہی کا احساس نہیں ہوتا۔ صحت کا احساس اس کو صرف اسی وقت ہوتا ہے جب کوئی بیماری آجاتی ہے یا وہ کسی دکھ درد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ بیمار انسان جتنا زیادہ بیمار ہوتا ہے اتنی ہی زیادہ اس کو اپنی صحت کی قدر ہوتی ہے۔

صحت اور تن درستی اللہ کی بڑی نعمتوں میں سے ہیں۔ صحت کی حفاظت کرنا، درحقیقت اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرنا ہے۔ صحت کی قدر نہ کرنا اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرنے کے برابر ہے۔ انسان جس چیز کی جتنی قدر کرتا ہے اتنا ہی وہ اس چیز کا مستحق ہو جاتا ہے۔

صحت انسان کے لیے ایک قیمتی چیز ہے۔ اگر صحت و تن درستی نہیں ہے تو

انسان کوئی کام اچھی طرح نہیں کر سکتا۔ دنیا کی تاریخ میں جن قوموں نے بڑا نام پایا ہے اور کمال حاصل کیا ہے ان کی کامیابیوں میں صحت کا بڑا دخل ہے۔ صحت جہاں انسان کے لیے ذاتی فائدے کی چیز ہے وہاں اس کی قومی اہمیت بھی ہے۔ افراد مل کر ہی ایک قوم کہلاتے ہیں۔ فرد کی صحت اچھی ہوگی تو قوم کی صحت بھی اچھی ہوگی۔ صحت مند قومیں دنیا میں کامیاب ہوتی ہیں اور اپنی جسمانی اور ذہنی قوتوں کی بدولت ترقی کرتی ہیں۔ بیمار اور کم زور قومیں نہ اپنی خوش حالی کے لیے محنت و مشقت کر سکتی ہیں اور نہ بیرونی دشمن کا مقابلہ کر کے اپنے ملک کی حفاظت کر سکتی ہیں۔ کم زور قومیں اپنی آزادی سے محروم ہو جاتی ہیں۔

صحت کی حفاظت کے لیے صفائی نہایت ضروری ہے۔ اسلام نے صحت اور صفائی کو ایک دوسرے کے لیے لازم قرار دیا ہے اور صفائی کی باقاعدہ تعلیم دی ہے۔ قرآن پاک میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے:

"اپنے کپڑے صاف ستھرے رکھا کرو اور ہر قسم کی گندگی سے پرہیز کیا کرو۔"

(المدثر: ۴-۵)

قرآن اور حدیث ایک طرف صحت کی حفاظت کے اُصول بتاتے ہیں اور ان کی پابندی کا حکم دیتے ہیں تو دوسری طرف صفائی اور پاکیزگی پر بھی زور دیتے ہیں۔ سونے اور جاگنے، کھانے اور پینے، دانت صاف کرنے، غسل اور وضو کرنے، تازہ ہوا، ورزش اور آرام غرض ہر معاملے میں اسلام نے ہمیں صاف صاف ہدایتیں دی ہیں۔ مثال کے طور پر نیند کو لیجیے۔ مناسب وقت تک سونا صحت مند زندگی کے لیے ضروری ہے، اس سے تھکن دور ہو جاتی ہے، جسم کو آرام ملتا ہے اور بدن کی کھوئی ہوئی طاقت بحال ہو جاتی ہے۔ اسلام یہ نہیں پسند نہیں کرتا کہ آدمی نہ سوئے یا نیند کے مناسب وقت میں کمی کر دے۔ اللہ کے رسولؐ رات کا زیادہ وقت جاگنے اور اللہ کی عبادت کرنے میں صرف کر دیتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو تاکید فرمائی کہ آپ مناسب وقت تک ضرور سویا کریں۔ ایک طرف نیند کے بارے میں مسلمانوں کو یہ ہدایت ہے اور دوسری طرف تاکید ہے کہ رات کو جلد سو جاؤ اور صبح کو جلد اُٹھ جاؤ۔

اسلام میں صفائی اور پاکیزگی پر خاص طور پر زور دیا گیا ہے اور اس کے بارے میں احکام بڑی تفصیل سے دیے گئے ہیں۔ ہر بچہ جانتا ہے کہ نماز کے لیے روزانہ پانچ وقت بدن کے وہ تمام حصے دھونے پڑتے ہیں جو گرد و غبار سے آلود ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ آنکھ، ناک، کان اور گلا بھی خوب صاف کرنا پڑتا ہے۔ تمام اعضا کو اس طرح دھونا پڑتا ہے کہ وہ اچھی طرح صاف ہو جائیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ وضو پورے طور پر کرنا چاہیے۔

صحت اور زندگی کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز پاک و صاف اور تازہ ہوا ہے۔ یہ اللہ کی بڑی نعمت ہے۔ تھوڑی دیر کھلی ہوا میں ٹہلنے اور ہلکی سی ورزش کرنے کے لیے ہمیں تھوڑا سا وقت ضرور نکالنا چاہیے۔ صحت کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم گہرے اور لمبے سانس لیں۔

ہوا کے بعد زندگی کی دوسری اہم اور قیمتی چیز پانی ہے۔ پانی ہماری غذا کا ایک اہم حصّہ ہے۔ جسم کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے صاف اور ٹھنڈے پانی سے زیادہ کوئی چیز نہیں۔ پانی کو صاف برتنوں میں رکھنا، باسی پانی استعمال نہ کرنا، پانی کو ڈھک کر رکھنا اور پینے سے پہلے اچھی طرح دیکھ لینا ضروری ہے۔ کھانے کے فوراً بعد زیادہ پانی نہیں پینا چاہیے۔ ضرورت ہو تو کھانے کے درمیان تھوڑا سا پانی پیا جا سکتا ہے۔ ہو سکے تو کھانے کے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد پانی پیا جائے۔

اچھی صحت کے لیے ہماری غذا کا بھی صحت کے اُصولوں کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ غذا زبان کے چٹخارے کے لیے نہیں، بلکہ جسم کی ضرورت کے لیے استعمال کرنی چاہیے۔ غذا میں ضروری اجزا توازن کے ساتھ ہونے چاہییں اور کھانا وقت پر کھانا چاہیے۔

اس سلسلے میں یہ اُصول یاد رکھنے چاہییں:

اپنی پسند کی مگر غذائیت والی چیزیں کھائیے۔

کم کھائیے۔

وقت پر کھائیے۔

خوب چبا کر کھائیے۔

اطمینان سے خوش ہو کر کھائیے۔

صحت اور تن درستی کے لیے ورزش اور آرام دونوں اہمیت رکھتے ہیں۔ چاق و چوبند اور خوش و خرم رہنے کے لیے ورزش بڑی ضروری ہے۔ ورزش کے بغیر دورانِ خون میں کمی ہو جاتی ہے، اس سے جگر سست، معدہ کم زور اور ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے۔ دل پر بھی اثر پڑتا ہے۔ اس لیے ورزش ضرور کرنی چاہیے۔ پیدل چلنا یا کوئی کھیل کھیلنا بھی اچھی ورزش ہے۔ ورزش نہ کرنے کی طرح جسم پر کام کا حد سے زیادہ بوجھ ڈالنا بھی صحت کے لیے سخت مُضر ہے۔ کام کے بعد آرام ضروری ہے۔ آرام کے بغیر جسم دوبارہ کام کے قابل نہیں رہتا۔

صحت کی حفاظت کے سلسلے میں ہوا، پانی، غذا، ورزش، آرام اور نیند کے علاوہ ماحول کی بھی بڑی اہمیت ہے۔ صحت کی حفاظت کے لیے ان تمام باتوں سے اہم بات میرے خیال میں روحانی اور اخلاقی پہلو کی ہے۔ صحت کے ان تمام اصولوں پر عمل کے ساتھ ساتھ اللہ پر ایمان اور بھروسا بھی ضروری ہے۔ اس سے دل کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ سکونِ دل کی دولت اسی کو حاصل ہوتی ہے جو اپنے اخلاق و کردار اور اپنی پوری زندگی کو اللہ اور اس کے رسولِ پاکؐ کے احکام کے مطابق ڈھال لیتا ہے۔ ایمان وہ طاقت ہے جو انسان کو زندگی کی سخت اور مشکل راہوں سے صحت اور سلامتی کے ساتھ گزرنے کا حوصلہ بخشتی ہے۔

مجلس کے آداب

اسلام ہمیں نہ صرف عبادت کے طریقے بتاتا ہے، بلکہ ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ لوگوں کے درمیان رہ کر زندگی کس طرح گزارنی چاہیے۔ یوں تو سبھی مذہبوں میں اخلاق پر زور دیا گیا ہے، اچھی عادتوں کی تلقین کی گئی ہے اور بُری عادتوں سے بچنے کی تاکید کی گئی ہے۔ لیکن اسلام میں لوگوں کے ساتھ معاملات اور اچھے اخلاق پر اتنا زور دیا گیا ہے کہ اگر انسان اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی بسر کرے تو اس کی کایا ہی پلٹ جاتی ہے۔

اچھے اخلاق میں مجلس میں بیٹھنے کے آداب بھی شامل ہیں۔ اسلام نے ان کی بھی تعلیم دی ہے۔ ایک انسان گھر میں اکیلا ہو تو وہ آزاد ہے۔ جیسے چاہے رہے لیکن جب وہ کسی مجمع میں یا مجلس میں ہو تو پھر اسے بہت سی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ بیٹھنے اُٹھنے میں، بات چیت میں اسے ایسا انداز اختیار کرنا ہوتا ہے کہ لوگوں کو اس کا آنا بُرا نہ لگے، آپس میں محبت بڑھے اور مجلس میں ایک وقار پیدا ہو۔

اسی لیے اسلام بتاتا ہے کہ مجلس میں انسان کو جہاں پہلے جگہ مل جائے وہیں کسی تکلف کے بغیر بیٹھ جائے۔ یہ نہیں کرنا چاہیے کہ مجمع کو چیر کر خواہ مخواہ آگے بیٹھنے کی کوشش کرے، کیوں کہ اس سے ایک تو پہلے سے آنے والوں اور بیٹھنے والوں کو تکلیف ہوتی ہے اور دوسرے ایسا کرنے والوں میں بڑائی کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اکثر جمعہ کی نماز میں یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جو لوگ پہلے آتے ہیں وہ بے ترتیب بیٹھ جاتے ہیں اور پھر آخر میں آنے

والے لوگ صفوں کو چیر کر آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کچھ لوگ محض اپنی بڑائی دکھانے کے لیے آگے کی صفوں میں بیٹھنا چاہتے ہیں۔ اس سے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے، پھر یہ آدابِ مجلس کے بھی خلاف ہے۔ اس لیے اس بات سے خاص طور پر منع کیا گیا ہے۔

کچھ لوگ دوسروں کو اٹھا کر ان کی جگہ بیٹھنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ بھی شاید اپنی بڑائی کے احساس میں مبتلا ہیں۔ کچھ لوگ یہ بھی کرتے ہیں کہ دو آدمی بیٹھے باتیں کر رہے ہیں وہ ان کے درمیان گھس جاتے ہیں۔ یہ بھی ایک ناپسندیدہ حرکت ہے۔

مجلس میں بیٹھ کر نرمی اور محبت سے باتیں کرنی چاہییں تاکہ مجلس کی فضا خراب نہ ہو۔ اختلاف کرنا ہی پڑے تو یہ بھی اچھے اور نرم لہجے میں کرنا چاہیے تاکہ کسی دوسرے کو تکلیف نہ ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صحابہ آتے رہتے تھے اور آپؐ ان کو مجلس کے آداب سکھاتے تھے۔ آپؐ نے اس بات کو منع فرمایا ہے کہ لوگ گھیرے میں بیٹھے ہوں تو ان کے بیچ میں بیٹھا جائے، کیوں کہ اس حالت میں کچھ لوگوں کی طرف اس کا منہ ہوگا اور کچھ کی طرف پیٹھ جو بڑی بدتمیزی ہے۔ اسی طرح مجلس میں کسی شخص کے گرد یا سامنے کسی کو کھڑا نہیں رہنا چاہیے کیوں کہ یہ غیر مسلم بادشاہوں کی عادت تھی کہ نوکر چاکر اور درباری وزیر اور امیر بادشاہ کے آگے کھڑے رہتے تھے۔

مسافروں اور راستہ چلنے والوں کے لیے حکم ہے کہ راستے میں بیٹھ کر باتیں نہ کریں، کیوں کہ یہ وقار کے خلاف ہے۔ اسی طرح آنے جانے والوں کو تکنا بھی بداخلاقی ہے حضورؐ نے جن اخلاقی باتوں کی پابندی کا حکم فرمایا ہے ان میں نگاہ نیچی رکھنا، تکلیف پہنچانے والی چیزوں کا راستے سے ہٹا دینا، سلام کا جواب دینا، نیکی کا حکم دینا، بُری باتوں سے روکنا، راستہ بھولے ہوؤں کو راستہ دکھانا اور مصیبت زدوں کی مدد کرنا شامل ہیں۔

چوں کہ انسان پر سب سے زیادہ اثر صحبت کا پڑتا ہے، اس لیے ہمیشہ ایسے لوگوں کے ساتھ بیٹھنا چاہیے جو نیک اور شریف ہوں، جن کے اخلاق اچھے ہوں اور جو اللہ سے ڈرتے ہوں۔

اللہ کے رسولؐ خود یہ دعا مانگا کرتے تھے:

"اے اللہ! مجھے نیک لوگوں کی صحبت عطا فرما۔"
اللہ اور اس کے رسولؐ نے مجلس میں جن باتوں کا خیال رکھنے کی ہمیں تاکید فرمائی ہے ان میں یہ بات بھی ہے کہ آپس میں کانا پھوسی نہیں کرنی چاہیے، کیوں کہ اس سے دوسرے لوگوں کو پریشانی ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کی غیبت نہیں کرنی چاہیے، ایک دوسرے کا مذاق نہیں اُڑانا چاہیے، لوگوں کو برے ناموں سے نہیں پکارنا چاہیے، گفت گو میں آواز کو نیچا رکھنا چاہیے اور مجلس میں بے شرمی کی باتیں نہیں کرنی چاہییں۔
دراصل قوموں کو بنانے اور بگاڑنے میں مجلسی زندگی کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ کسی قوم کی مجلسوں ہی سے اس کی تہذیب اور اس کے طور طریقوں کا پتا چلتا ہے۔ اسی لیے اسلام نے مجلس کے آداب پر خاص زور دیا ہے اور ان کے بارے میں صاف ہدایات دی ہیں۔

قومی کردار

جس طرح لوگ اپنی چال ڈھال، شکل و صورت، لباس اور عادتوں سے پہچانے جاتے ہیں اسی طرح قومیں اپنی خصوصیات اور صفتوں سے پہچانی جاتی ہیں۔ افراد کی طرح قوموں کی بھی ایک شخصیت ہوتی ہے۔ یہی شخصیت ان کو دوسری قوموں سے ممتاز کرتی ہے اور اسی کی بنا پر قوموں کی برادری میں ان کا مقام اور مرتبہ متعین ہوتا ہے۔ جس طرح ایک فرد کا اپنا مخصوص مزاج ہوتا ہے اسی طرح ایک قوم کا بھی اپنا مخصوص مزاج ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ قومی مزاج کے بننے میں بہت سی چیزیں کام کرتی ہیں۔ جس خطّے میں کوئی قوم آباد ہوتی ہے اس کی غذا اور اس کا لباس اس خطّے کی آب و ہوا، اس کے جغرافیے اور اس کے موسم کے مطابق ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر گرم خطّوں میں رہنے والوں کی غذا اور لباس سرد خطّوں میں رہنے والوں کی غذا اور لباس سے مختلف ہونا فطری بات ہے۔ لیکن ان سب چیزوں سے بڑھ کر قومی کردار ہے جس سے کسی قوم کی شناخت ہوتی ہے۔ جب ہم کسی قوم کے بارے میں کوئی رائے قائم کرتے ہیں یا کوئی فیصلہ کرتے ہیں تو اس کے اجتماعی کردار کو سامنے رکھ کر ہی کرتے ہیں۔ دنیا میں تمام قومیں عروج اور زوال اور ترقی اور تنزلی کے دور سے گزرتی ہیں اور ان کی بنیاد ان کا اجتماعی کردار ہی ہوتا ہے۔

کردار اگر اعلا اور پاکیزہ ہوتا ہے تو قوم ترقی کرتی ہے، لیکن کردار کمزور

اور خراب ہو تو قوم کو زوال کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ ایک اصول ہے، یہ تاریخ کا سکھایا ہوا سبق ہے۔ اس اصول کی خلاف ورزی کبھی نہیں ہوتی۔ تاریخ میں کبھی اس کے خلاف نہ ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ جن قوموں نے زندگی کی اچھی قدروں اور اعلا معیاروں کو چھوڑ دیا ہے وہ پستی میں چلی گئی ہیں، اور جن قوموں نے اعلا کردار کا ثبوت دیا ہے اور صحت مند اصولوں پر قائم رہی ہیں انھیں بلندی نصیب ہوئی ہے۔ کم زور کردار والی قومیں ناکامی سے کبھی نہیں بچ سکیں۔ اللہ تعالیٰ کی سنّت ہے کہ اعمال کا نتیجہ سامنے آ کر رہتا ہے۔ اچھے اعمال کا اچھا نتیجہ اور بُرے اعمال کا بُرا نتیجہ۔ اللہ کے نزدیک تمام انسان اور تمام قومیں برابر ہیں۔ کسی کو کسی پر کوئی بڑائی حاصل نہیں ہے۔ اگر کسی کو کوئی بڑائی حاصل ہے تو وہ صرف ایمان اور کردار کی بنا پر۔

قرآنِ پاک میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جب ایک قوم اپنے کردار کی خرابی کے نتیجے میں اپنے آپ کو گرا لیتی ہے تو اللہ تعالیٰ کسی دوسری قوم کو اس کی جگہ اٹھا دیتا ہے۔ قرآن پاک نے قوموں کی تباہی اور ان کی بربادی کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ انھوں نے ظلم کا طریقہ اختیار کر لیا۔ گویا قومی کردار کا سب سے خراب پہلو ظلم اختیار کرنا ہے۔

ہم روز دیکھتے ہیں کہ جو لوگ ظلم کا طریقہ اپنا لیتے ہیں ان میں بے شمار دوسری بُرائیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں۔ وہ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ کہنے لگتے ہیں۔ انصاف نہیں کرتے، میانہ روی چھوڑ دیتے ہیں، رحم، ہمدردی اور درگزر سے ان کو کوئی واسطہ نہیں رہتا۔ ان کی زندگیوں سے سکون اور اطمینان غائب ہو جاتا ہے، وہ کسی کے کام آنے کے قابل نہیں رہتے، کسی سے تعاون نہیں کر سکتے۔ ظلم کو اپنانے والے کسی کی صحیح بات سننے اور کوئی جائز مطالبہ ماننے کو تیار نہیں ہوتے، ان میں صبر و تحمل اور برداشت کی قوت نہیں رہتی۔ وہ اپنی ہر بات کو صحیح سمجھتے ہیں اور اس کو جائز اور ناجائز طریقے سے منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان میں اچھائی اور بُرائی کی تمیز نہیں رہتی۔ وہ انسانیت، شرافت، مروّت اور اچھے سلوک کے

معنی بھول جاتے ہیں۔ انکسار اور عاجزی کی اعلا خوبیوں کے بجائے ان میں غرور اور تکبّر پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے مزاجوں میں نرمی کے بجائے سختی آجاتی ہے۔ وہ کسی سے اچھی طرح بات نہیں کرتے اور ہمیشہ اپنے آپ کو اچھا اور دوسرے کو بُرا سمجھتے ہیں۔

اس کے مقابلے میں جو قومیں ظلم کو بُرا سمجھتی ہیں اور اس سے دور رہتی ہیں، اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کرتی ہیں اور اچھے کردار کا ثبوت دیتی ہیں وہ ان کم زوریوں میں مبتلا نہیں ہوتیں۔ وہ سچائی کی علم بردار ہوتی ہیں، انصاف ان کا طریقہ ہوتا ہے اور اعتدال ان کی راہ۔ ایثار، ہمدردی، رحم اور تعاون ان کا شعار ہوتا ہے۔ اعلا کردار کی قومیں دوسروں کی بھلائی چاہتی ہیں۔ وہ محنت کی عادی، سادگی پسند اور وفادار ہوتی ہیں۔

ایسی قوموں کے افراد آپس میں ریشم کی طرح نرم ہوتے ہیں۔ لیکن جب جھوٹ اور سچ کا مقابلہ ہوتا ہے تو سچ کی حمایت میں فولاد سے زیادہ سخت ہوتے ہیں۔ وہ سچ کہتے ہیں اور سچ سنتے ہیں، چاہے وہ ان کے خلاف ہو۔ وہ حق دار کا حق پہچانتے ہیں، دوسروں کا حق اسی طرح ادا کرتے ہیں جس طرح اپنا حق مانگتے ہیں۔ وہ فرائض کو بھی اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں جتنی حقوق کو۔ وہ کسی کو تکلیف نہیں دیتے، خدمت کو عظمت سمجھتے ہیں اور اخوت اور برابری کے قائل ہوتے ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

"بندہ ایمان کی حقیقت کو اس وقت تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ وہ سارے انسانوں کے لیے وہی بھلائی نہ چاہے جو وہ اپنے نفس کے لیے چاہتا ہے۔"

کام یاب زندگی کے لیے یہ ایک بنیادی بات ہے اور یہی تمام اخلاقی کاموں کی بنیاد ہے۔ اس سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہے کہ سب کے ساتھ نیکی کرنا چاہیے۔ ایک جگہ حضورؐ نے واضح

بھی فرما دیا ہے کہ مسلمان جب نیکی کرے تو کافر، مسلمان، نیک اور بد سب کے ساتھ کرے۔ اخلاق کی بلندی یہی ہے اور ایسے اخلاق ہی وہ ستون ہیں جن پر قوموں اور جماعتوں کی زندگی کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اخلاق ہی سے قوّت، طاقت، عزّت، سلطنت اور عظمت حاصل ہوتی ہے۔ اخلاق ہی وہ چیز ہے جس سے انسان اللہ تعالیٰ کا نائب بنا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ

"اللہ تعالیٰ کے اخلاق کو اپنا اخلاق بناؤ۔"

بچو! یہ بات یاد رکھو کہ دنیا میں وہی قومیں ترقّی کرتی ہیں جن کے اخلاق اچھے ہوتے ہیں اور اسی سے ان کا مستقبل بنتا ہے۔ اگر ہمیں ترقی کرنا ہے اور قوموں کی برادری میں اونچا مقام حاصل کرنا ہے تو ہماری قوم کے ہر فرد کو اخلاق کی طاقت حاصل کرنی ہو گی۔

بچّوں کی مذہبی کتابیں

حضرت محبوب الٰہیؒ	۲/-	ہمارا دین (اوّل، دوم، سوم) فی حصہ	۷/۰
حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ	۲/-	اسلام کے مشہور سپہ سالار (اوّل)	۴/۰
حضرت فرید الدین گنج شکرؒ	۲/۰	اسلام کے مشہور سپہ سالار (دوم)	۴/۰
حضرت معین الدین چشتیؒ	۲/۰	اسلام کے مشہور امیر البحر	۴/۵۰
حضرت ابوبکر صدیقؓ	۶/۰	قرآن پاک کیا ہے؟	۳/۰
حضرت طلحہؓ	۳/۰	اسلام کیسے شروع ہوا؟	۶/۵۰
حضرت سلمان فارسیؓ	۳/۰	رسول پاکؐ	۶/۰
حضرت ابوذر غفاریؓ	۳/۰	اللہ کا گھر	۳/۰
حضرت عبداللہ بن عمرؓ	۳/۰	رسول پاک کے اخلاق	۳/۰
حضرت عبداللہ بن عباسؓ	۳/۰	اللہ کے خلیل	۳/۰
نیک بیٹیاں	۳/۵۰	تحسین القرآن	۴/۵۰
حضرت محمدؐ (ہندی)	-/۶۰	منہاج القرآن	۴/۵۰
ہمارے نبیؐ (ہندی)	۰/۴۰	ارکانِ اسلام	۲/۵۰
امیر خسروؒ	۳/۰	عقائدِ اسلام	۳/۵۰
دس جنتی	۴/۵۰	چار یار	۴/۵۰
اسلام کیسے پھیلا اوّل	۷/۵۰	آں حضرتؐ	۳/۰
اسلام کیسے پھیلا دوم	۶/۰	خلفائے اربعہ	۶/۵۰
پیارے رسولؐ	۴/۵۰	نبیوں کے قصے	۵/
اللہ کے صفی	۲/۰	ہمارے رسولؐ	۴/۵۰
حضرت نظام الدین اولیاؒ	۲/۰	مسلمان بیبیاں	۴/۰
سرکار کا دربار	۴/۵۰	ہمارے نبیؐ	۳/۰
قاعدہ یسرنا القرآن	۲/۲۵	سرکارِ دو عالمؐ	۳/۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

برقی آرٹ پریس (پروپرائٹرز: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ) پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی